ترقی پسند ادب کا ترجمان

انگارے

مرتبہ

سیّد عامر سہیل

ماہانہ کتابی سلسلہ نمبر ۵۳

پانچواں سال پانچویں کتاب

مئی ۲۰۰۷ء

مراسلت: ۵۴۵/c گل گشت کالونی، ملتان
ای میل: angarey_90@hotmail.com
فون: ۰۳۰۰-۹۶۳۸۵۱۶ / ۰۳۲۲-۶۱۲۵۷۲

کمپوزنگ: اظہر خان، نذر خان (یونی کارن کمپیوٹرز چونگی نمبر ۶ ملتان)
قیمت: تیس روپے
زرِ سالانہ (بارہ شمارے): ۴۰۰ روپے

ترتیب

۱۔ چند باتیں — سید عامر سہیل — ۳

گفتگو:

۲۔ انتظار حسین سے ڈرامے پر گفتگو — آصف فرخی — ۴

مضامین:

۳۔ اردو شاعری میں قنوطیت: نظیر اکبر آبادی (قسط پنجم) — ڈاکٹر قاضی عبدالستار (بھارت) — ۱۵

۴۔ ایسرڈ: ماورائے عقل — پروفیسر رضی عابدی — ۲۶

۵۔ رشید امجد کی افسانہ نگاری — شفیق انجم — ۳۰

کہانی:

۶۔ آہ کیو کی سچی کہانی — لوہسون/ ڈاکٹر شاہ محمد مری — ۴۱

۷۔ میں کائنات ہوں — اخلاق انصاری/ننگر چنا — ۷۸

خاکہ:

۷۔ محبت کی موت — ڈاکٹر عباس برمانی — ۸۱

غزلیات:

۹۔ ظفر اقبال (چار غزلیں)، قاضی حبیب الرحمٰن (ایک غزل)، ڈاکٹر سعید اقبال سعدی (دو غزلیں)، مشتاق شبنم (دو غزلیں)، حصیر نوری (دو غزلیں)، صابر عظیم آبادی (دو غزلیں)، محمد فیروز شاہ (ایک غزل)، تزئین راز زیدی (ایک غزل)، نبیل احمد نبیل (دو غزلیں) — ۸۶ تا ۹۶

☆☆☆

سید عامر سہیل

چند باتیں

شعبۂ اردو، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی کے زیر اہتمام ۱۹ تا ۲۱ اپریل ۲۰۰۷ء کو بین الاقوامی اردو کانفرنس منعقد ہوئی جس میں تین بڑی ادبی تحریکوں علی گڑھ، ترقی پسند اور جدیدیت کے حوالے سے نامور ادیبوں اور دانشوروں نے اپنے مقالات پیش کیے۔ اس بھرپور علمی و ادبی کانفرنس میں بہت سی نامور ہستیاں اکٹھی دیکھنے میں آئیں۔ مقالات، گفتگو اور سوال و جواب کے تقریباً سارے سیشنز بڑے بھرپور تھے۔ یقیناً شعبۂ اردو کے اساتذہ خصوصاً ڈاکٹر انوار احمد اور ڈاکٹر روبینہ ترین (چیئر پرسن) اس حوالے سے مبارک باد کے مستحق ہیں کہ ان کی کاوشوں کے سبب ایسی بھرپور کانفرنس منعقد ہوئی۔

اس کانفرنس کا حاصل ۲۱ اپریل کو سامنے آیا جب انجمن ترقی پسند مصنّفین ایک طویل عرصہ کے بعد پھر سے فعال ہوئی اور اس دن انجمن کی تشکیلِ نو ہوئی۔ یہ دن واقعی تاریخی دن تھا کیونکہ نصف صدی پہلے انجمن ترقی پسند مصنّفین پر وقت کے آمروں نے پابندی عائد کر دی تھی اس دن سے ظلم، جبر اور استحصال کا نہ رکنے والا سلسلہ شروع ہوا اور مفاد پرستوں نے حب الوطنی، مذہب، زبان اور نظریے کے نام پر وہ بازار گرم کیا کہ خدا کی پناہ۔ اس جبر میں سبھی شامل تھے، تاریخ میں ان کے چہروں کو دیکھا جا سکتا ہے۔ پھر ۲۱ اپریل کو ایک بار پھر وہ تاریخی لمحہ آیا کہ ترقی پسند تحریک کو از سرِ نو تشکیل دیا گیا۔ اس دن ماضی، حال اور مستقبل کے سبھی حوالے اکٹھے تھے۔ حمید اختر، حسن عابد، واحد بشیر، ڈاکٹر محمد علی صدیقی، راحت سعید، مسعود اشعر، زاہدہ حنا، ڈاکٹر مبارک علی، ڈاکٹر تبسم کاشمیری، ڈاکٹر انوار احمد، رشید مصباح، قاضی جاوید، ڈاکٹر شاہ محمد مری، صلاح الدین درویش، عابد حسین عابد، بنگر چنا، عابد میر، شاکر حسین شاکر، رضی الدین رضی اور ڈاکٹر عباس برمانی اور بہت سے بزرگوں، جوانوں اور نوجوانوں کا یہ اجتماع یقیناً تاریخی واقعہ ہے۔

اس تاریخی موقع پر تحریک کے ماضی، حال اور مستقبل کے امکانات کے حوالے سے بہت سی باتیں ہوئیں۔ تحریک کے ماضی کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا، اس کی فی زمانہ ضرورت و اہمیت پر زوردار تقریریں ہوئیں اور امکانات پر روشنی ڈالی گئی۔ سبھی لوگ بڑی پُر جوش اُمیدوں کے ساتھ اس تشکیلی عمل کو دیکھ رہے تھے۔

یقیناً ادبی دنیا میں یہ واقعہ تاریخ ساز اہمیت کا حاصل ہوگا۔ ۳۵-۱۹۳۶ء میں بننے والی انجمن ترقی پسند مصنّفین جن حالات سے گزری اور جو کردار اُس سے ادا کیا وہ واقعی بے مثل تھا۔ آج عالمی اور ملکی حالات کے پیشِ نظر اِس بات کی ضرورت دو چند ہوگئی ہے کہ یہ تحریک ایک بار پھر اپنا روشن خیال اور خرد افروز کردار ادا کرے۔

انگارے کا شمارہ پریس میں جا رہا تھا کہ ایک اندوہناک خبر آئی کہ کراچی میں مقیم نامور ترقی پسند ادیب اور دانشور حسن عابد انتقال فرما گئے۔ یہ خبر بہت دل خراش تھی۔ ابھی ۲۱ اپریل ہی کو ان سے تفصیلی ملاقات ہوئی تھی۔ حسن عابد کا انتقال ادب کے لیے عموماً اور ترقی پسند تحریک کے لیے خصوصاً بڑی غم ناک سانحہ ہے کہ اِتنے مخلص، بے لوث، دانشور سے تحریک کو محروم ہونا پڑا۔

آصف فرخی

انتظار حسین سے ڈرامے پر گفتگو

آصف فرّخی:　آپ کی حیثیت بنیادی طور پر افسانہ نگار کی ہے اور بجا طور پر۔ ڈرامے کو اس میں افسانہ نگاری کی کوئی ضمنی حیثیت حاصل ہے یا کوئی الگ سے حیثیت حاصل ہے آپ کے کام میں؟

انتظار حسین:　نہیں، میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ الگ سے حیثیت حاصل ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ میرا میدان مختصر افسانہ ہے اصل میں۔ ناول بھی میں نے لکھے ہیں تو وہ اب فکشن کی ذیل آ جاتا ہے، مختصر افسانہ اور ناول۔ اب یہ ڈرامے کے متعلق میں طے نہیں کر سکا کہ جو کچھ میں نے لکھا ہے اس کو میں کیا حیثیت دوں۔ تو میں نے اپنے آپ کو ڈرامہ نگار کبھی سمجھا نہیں تھا۔ اور ایک چیز یہ ہے کہ ڈرامہ میری دانست میں اسٹیج ڈرامہ ہے۔ یہ جو ریڈیو کے لیے ڈرامے لکھے گئے یا ٹی وی کے لیے ڈرامے لکھے گئے اور ہمارے ہاں لکھے جاتے ہیں، تو میں سمجھتا ہوں اس کی حیثیت یہ ہے کہ زیادہ تر کمرشل رائٹنگ کہہ لیجیے بالخصوص جو ٹی وی ڈرامہ ہے۔ اس ڈرامے کو سنجیدہ تخلیقی سرگرمی کے ذیل میں بڑی مشکل سے شمار کروں گا۔ تو اسٹیج ڈرامے..... میرے ہاں کا اس آغاز میرے ہاں عجیب طریقے سے ہوا۔ میں ریڈیو ڈرامے تو لکھ رہا تھا۔ ۰۵ء کی بات ہے۔

آصف فرخی:　یہ ریڈیو ڈرامے کی طرف آپ کیسے آئے، پہلے تو یہ بتائیں یعنی ریڈیو کے لیے آپ نے پہلا ڈرامہ کب لکھا؟ کیوں لکھا؟ کیسے لکھا؟

انتظار حسین:　یہ بھی مطالبے پر لکھا۔ ہمارے ایک دوست تھے وہاں ریڈیو پر، اظہار کاظمی تو اصل میں وہ ذمّے دار ہیں، ریڈیو ڈرامہ لکھوانے کے مجھ سے۔ پھر اور دوست بھی، رضی ترمذی نے بھی مجھ سے بہت اصرار کر کے لکھوائے۔

اچھا اسٹیج ڈرامہ جو میں نے پہلے لکھا تو اس کا بھی میں کریڈٹ اظہار کاظمی کو ہی دیتا ہوں کیونکہ انہوں نے ایک گروپ بنایا تھا، ایک ڈرامہ گروپ۔ اور وہ یہ چاہتے تھے کہ کوئی اوریجنل ڈرامہ کریں۔ سولا ہور میں جتنے بھی ڈرامے ہوئے تھے، وہ کہیں سے لیے ہوئے تھے طبع زاد ڈرامہ نہیں ہوتا تھا، وہ adaptation ہوتے تھے۔ تو انہوں نے کہا کہ ہم اوریجنل پلے کرنا چاہتے ہیں۔ تو میں نے کہا کہ وہ تو میرا کوئی تجربہ نہیں ہے، میں نے تو ریڈیو پلے لکھا۔ تو انہوں نے کہا کہ نہیں، آپ لکھیں، تو ۰۵ء کے شروع ہی میں کہیں یہ پلے لکھا گیا اور جب تک یہ کھیل مکمل ہوا وہ گروپ

ٹوٹ گیا۔ کھیل ہو ہی نہیں سکا۔ پھر کتنے ہی سالوں کے بعد جب وہ سرگرمی شروع ہوئی آرٹس کونسل میں تو یہ لے گیا یہ شخص کمال احمد رضوی، اور اس میں بھی یہی ہوا کہ پہلے تو آرٹس کونسل کی کمپنی نے وہ رد کر دیا کہ بھئی اس میں ڈائیلاگ بہت لمبے ہیں، اس میں زبان ایسی ہے کہ یہاں کی audience اس کو سمجھے گی نہیں تو یہ فلاپ ہو جائے گا۔ تو اس پر کمال احمد رضوی کو بہت غصہ آیا۔ تو اس نے کہا کہ میں اپنے گروپ کی طرف سے اسے کروں گا، تو اس نے کیا اور یہ ڈرامہ ہٹ ہو گیا۔ یہ واقعہ اس طریقے سے ہوا تو پھر آرٹس کونسل والوں نے ہم سے کہا کہ ایک ڈرامہ ہمارے لیے بھی آپ لکھ دیں۔ وہ ڈرامہ ہم نے لکھا ''درد کی دوا کیا ہے؟'' تو ڈرامہ کا میں نے سوچا کہ اب زیادہ تجربہ ہو گیا ہے۔ اب میں بہتر لکھوں گا لیکن پتہ چلا کہ وہ ڈرامہ جو بہتر لکھا تھا نہیں لکھ سکا۔

آصف فرّخی: جب آپ نے ''خوابوں کے مسافر'' لکھا تو آپ کی افسانہ نگاری میں اس وقت کیا ہو رہا تھا، یعنی کون سے افسانے اس کے آس پاس تھے۔

انتظار حسین: کچھ نہیں، یعنی حقیقت نگاری کے جو افسانے شروع کیے ہیں اور اسی زمانے میں لکھا۔ ''خوابوں کے مسافر'' بھی اس زمانے میں لکھا گیا۔ یہ بھی اسی ذیل میں آتا ہے۔ جب میں نے یہ کوشش کی ایک مرتبہ کہ میں جس قسم کا افسانے میں تجربہ کر رہا ہوں کہ کہیں داستان لے آیا کہ کہیں اس قسم کے تجربے کر رہا ہوں تو چلو ڈرامے میں بھی کر کے دیکھتا ہوں۔ تو میں نے کہا کہ کسی داستان کے حوالے سے آج تک صورت حال تو ملا جلا کر ایک پلے لکھا ''آٹھواں سوال'' اسی طریقے کی ایک کوشش میں نے سب سے پہلے کی ان کا ایک پلے لیا آغا حشر کا، اس کا نام تھا ''نیک پروین''۔ میں نے لکھا ''نیک پروین'' ہمارے زمانے میں جس میں تانیثیت بھی آ جاتی ہے، تو وہ ڈرامہ بھی لکھا۔ لیکن دونوں میں نے اسٹیج کے لیے لکھے تھے اور اسٹیج والوں نے اسے قبول نہیں کیا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس ڈرامے کو اسٹیج سے کریں۔ وہ دونوں میں نے ٹی وی کو دے دیے پہ وہ ہو گئے اور وہ ٹھیک ٹھاک کامیاب رہے۔

آصف فرّخی: کیا ٹی وی کے لیے ان ان کو کچھ بدلنا پڑا یا کوئی تبدیلی ہوئی۔

انتظار حسین: نہیں، کچھ نہیں بدلنا پڑا۔ وہ لانگ پلے تھا، تو انہوں نے لانگ پلے کے طور پر کیا اور انہوں نے پسند کیا کہ ہاں، یہ بالکل ہمارے لیے ٹھیک ہے تو اس طریقے سے ڈرامے لکھے گئے، باقی میں نے ٹی وی کے لیے الگ اور ڈرامہ بھی لکھے، کچھ کہانیوں کو ڈرامہ بنا دیا۔ کچھ اوریجنل ڈرامے بھی لکھے۔ تو اب میں کہہ نہیں سکتا کہ میں نے ڈرامے کے لیے، واقعی ڈرامے کی صنف کے لیے کچھ کیا ہے۔ میں اطمینان سے نہیں کہہ سکتا۔

آصف فرّخی: لیکن یہ تو کیا ہے کہ چار تو بڑے ڈرامے لکھے۔

انتظار حسین: یہی سوچ کر میں نے لکھا کہ اگر میں نے اصل ڈرامہ لکھنا ہے تو فل لینتھ پلے

لکھنا چاہیے اور چونکہ میرا ایک ڈرامہ اسٹیج پر کامیاب ہو چکا تھا اس لیے اس بات کا مجھ میں اعتبار پیدا ہو گیا کہ میں اسٹیج ڈرامہ لکھ سکتا ہوں۔

آصف فرّخی: اچھا انتظار صاحب، اس سوال کو اور تھوڑا سا پیچھے کی طرف لے جاتے ہیں۔ حسن عسکری کا مضمون ہے کہ ہمارے ہاں ڈرامہ کیوں نہیں ہے۔ انہوں نے بنیاد یہی اٹھائی ہے کہ اردو میں ڈرامہ نہیں ہے اور میرا خیال ہے کہ آپ بھی یہی ثابت کر رہے ہیں کہ آپ ڈراموں کے لکھنے کے باوجود اصل میں ڈرامہ نگار نہیں ہیں۔ ڈرامہ لکھنے کی جو رکاوٹیں ہوتی ہیں ان کی تو خاصی طویل فہرست عسکری صاحب نے بتائی ہے مگر اصل نکتہ ان کا یہ ہے کہ ہماری تہذیب میں وہ ڈرامائی کشمکش نہیں ہے، کوئی ایسی بات آپ کے ذہن میں بھی ہے۔

انتظار حسین: نہیں، میرے ذہن میں تو نہیں ہے مگر میں نے عسکری صاحب کا وہ مضمون پڑھا اور وہ مضمون مجھے اچھا بھی لگا۔ عسکری صاحب کا استدلال خوب ہوتا ہے اور غلط استدلال بھی کریں تو ہمیں اچھا ہی لگتا ہے۔ تو ان کا یہ کمال ہے۔ تو یہ مضمون بھی مجھے اچھا لگا تھا لیکن میں نے کبھی اپنے طور پر یہ نہیں سوچا کہ ہمارے معاشرے میں، ہماری ادبی روایت آخر ڈرامہ کیوں نہیں پنپتا، یہ سوال ضروری ہے۔ آخر یہ ایک ایسا دور آیا پارسی تھیٹر کا کہ جس میں اردو ڈرامے کو بہت فروغ ہوا اور پبلک اپیل والا ڈرامہ لکھا گیا۔ ایسا نہیں کہ محض ادبی قسم کا تجربہ ہوا۔ اسے ادبی تجربہ نہیں کہہ سکتے۔ اس کے باوجود وہ وہیں رک گیا تھا۔ اس کے بعد چلا ہی نہیں۔

آصف فرخی: عسکری صاحب نے اپنے مضمون کا عنوان تو یہ رکھا ہے کہ ہمارے ہاں ڈرامہ کیوں نہیں مگر وہ کہہ یہ رہے ہیں ''ہمارے ہاں ڈرامہ کیوں نہیں ہو سکتا''، یعنی اردو میں ڈرامہ ممکن نہیں ہے کیونکہ جس تہذیب کی اردو پروردہ ہے وہاں وہ ڈرامائی کشمکش ممکن نہیں ہے۔ آپ کیا اس بات سے متفق ہیں؟

انتظار حسین: نہیں، ایسا نہیں۔ میں نے اس پر ایک مضمون لکھا تو اس میں، میں نے یہ لکھا کہ اگر انیس مرثیہ نگار نہ ہوتا تو ڈرامہ نگار ہوتا اور مرثیے کے سلسلے میں اس شخص کی مشکل یہ تھی کہ ہماری تہذیب اجازت نہیں دیتی کہ واقعۂ کربلا کو اسٹیج پر پیش کیا جا سکے۔ تو اس بے چارے نے اس رکاوٹ کو محسوس کرتے ہوئے مرثیے کو ہی ڈرامہ بنانے کی کوشش کی، اور خود مرثیہ بھی اس طریقے سے وہ پیش کرتے تھے جیسے ون مین شو ''One man show'' ہو رہا ہو۔ تو میں نے کہا ہماری تہذیب کی جو پابندیاں تھیں، اس نے انیس کو ڈرامہ نگار کے طور پر پنپنے نہیں دیا۔ وہ بے چارہ مرثیے کی حدود میں رہا اور اپنا ڈرامائی ٹیلنٹ اس نے مرثیہ نگاری اور مرثیہ خوانی دونوں تک اس نے محدود رکھا۔ لیکن اس کے بجائے لکھنؤ میں دوسرا ایک شخص پیدا ہوا۔ جس نے پہلا ڈرامہ لکھا، اندر سبھا۔ تو ڈرامے کو پیدا ہونا تھا لکھنؤ ہی میں۔ وہ اگر میر انیس نہیں ہوئے تو امانت لکھنوی

ہو گئے۔ یہ میرا چھوٹا سا ایک تھیسس تھا اس مضمون میں۔

آصف فرخی: اچھا ایک تو انیس کے ڈرامے کا اثر ہو گیا اور ذرا پیچھے جایئے تو ایک ایسا آدمی ہے جس کی آپ نے بڑی تعریف کی ہے افسانے کے حوالے سے، وہ چیخوف ہے لیکن چیخوف کی زندگی میں ایک موڑ ایسا آتا ہے کہ وہ ڈرامہ نگار بن جاتا ہے۔ اور وہ مغربی دنیا کے بہت بڑے ڈرامہ نگاروں میں سے ایک ہے۔ وہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ افسانے سے ڈرامے کو کون سا راستہ نکلتا ہے۔

انتظار حسین: آپ اگر مجھ سے پوچھیں، تو میں نے ڈرامہ بہت کم پڑھا ہے مغرب کا۔ مگر میں نے اس کے وہ ڈرامے سب پڑھے ہیں۔ ایک آدھ کوئی رہ گیا ہو تو میں کہہ نہیں سکتا۔ لیکن مجھے وہ ڈرامہ نگار بہت اچھا لگتا ہے اور اگر میں ڈرامے میں ہی ذرا سا کوشش کرتا لکھنے کی تو میں واقعی اس قسم کا ڈرامہ لکھنے کی کوشش کرتا جیسے تھری سسٹرز ہے یا اس قسم کے اور ڈرامے ہیں اس کے۔ میرے لیے تو ڈرامہ نگار کی حیثیت سے بھی چیخوف ایک ..... میرے لیے inspiration کا ذریعہ ہے۔

آصف فرخی: اچھا تو پھر یہ بتایئے کہ اس کے ڈراموں میں آپ کو کیا بات اچھی لگتی ہے؟

انتظار حسین: وہ جو افسانہ نگاری میں اس کا وصف ہے وہ مجھے اس کے ڈراموں میں بھی نظر آتا ہے، وہ اس قسم کا نہیں ہے اس میں سسپنس ہو، کوئی بہت ڈرامائی موڑ آئے، اس قسم کے ڈرامے اس نے لکھے نہیں، وہ اسی طریقے سے، آہستگی سے، یعنی غیر ڈرامائی ڈرامہ ہوتا تھا، تو مجھے وہ اچھا لگتا ہے۔

آصف فرخی: یعنی اس میں کوئی اتنی بڑی کشمکش اس طرح نظر نہیں آتی.....

انتظار حسین: کوئی ایسی کشمکش نظر نہیں آتی۔

آصف فرخی: وہ کشمکش کہیں دور ہو رہی ہے۔

انتظار حسین: دور ہو رہی ہوتی ہے لیکن اس کے یہاں ظاہر میں نظر نہیں آتی۔

آصف فرخی: اچھا، آپ نے ابھی کہا کہ آپ ڈرامہ زیادہ شوق سے نہیں پڑھتے، لیکن جن لوگوں کو آپ نے پڑھا ہے ڈرامے میں، ان میں کون سے لوگ اچھے لگے، چیخوف کے علاوہ۔

انتظار حسین: ایک ڈرامہ نگار مجھے بہت اچھا لگا تھا، سنج، JM Synge۔ اس کا ایک ڈرامہ تو میرے لیے اس وقت بڑی اہمیت رکھتا تھا اور اس نے مجھے بہت متاثر کیا۔ اور شاید میری افسانہ نگاری پر کہیں اس کا اثر و ترمل جائے، وہی چھوٹا سا ڈرامہ ہے۔

آصف فرخی: ایک اس کا ڈرامہ بڑا مشہور ہوا تھا— The Play Boy of the Western world.

انتظار حسین: نہیں، میں نے وہ پڑھا ہے— وہ نہیں، وہ چھوٹا ڈرامہ ہے جس میں وہی آتا ہے سمندر کی طرف جاتے ہیں وہ..... Riders to the Sea۔

آصف فرخی: وہ تو بڑا haunting قسم کا ڈرامہ ہے۔

انتظار حسین: وہ haunting ہے۔ اسی وجہ سے وہ مجھے پسند ہے۔ وہ ڈرامہ جو ہے، میں نے جتنے ڈرامے پڑھے ہیں، اگر میں ان کو ذہن میں لاؤں تو مجھے سب سے پہلے وہ ڈرامہ یاد آتا ہے۔

آصف فرخی: یہ تو آپ نے بالکل ایک نئے influence کا ذکر کیا ہے جس کا آپ کی باقی تحریروں سے نہیں اندازہ ہوتا کہ آپ کو وہ آدمی پسند ہوگا۔ اچھا— ڈرامے کی جو اور روائتیں ہیں وہ جاپانی ڈرامے ہیں، چینی ڈرامے ہیں، اور یعنی مغربی ڈرامے کے علاوہ پھر کچھ سنسکرت کا ڈرامہ ہے اس سے بھی دلچسپی رہی آپ کو؟

انتظار حسین: نہیں، زیادہ نہیں، لیکن یہ جو آج کل کا ڈرامہ نگار ہے ناں— جس کا بہت اب حوالہ آنے لگا تھا اور جسے ترقی پسندوں نے بھی اپنے گروپ میں بھی لیا اور اس کے ڈرامے کیے، وہ جرمن ڈرامہ نگار ہے..... بریخت.....

بریخت کے بھی کچھ ڈرامے پڑھے اور وہ مجھے اچھے لگے۔ اور اس کی بھی مجھے یہ بات اچھی لگی کہ وہ اپنی پرانی کوئی حکایت وغیرہ لے کر یا قدیم کو لا کر اور جدید میں سمویا کرتا تھا— تو وہ ڈرامہ نگار مجھے اچھا لگا۔

آصف فرخی: کچھ ایبسرڈ ڈرامے سے بھی دلچسپی رہی کیونکہ ''چراغوں کا دھواں'' میں آپ نے ذکر.....

انتظار حسین: بالکل اچھا یاد دلایا، کچھ ڈرامے وہ بھی پڑھے۔ ایک ڈرامہ ٹھیک ہے، سبھی نے پڑھا ہے اور مجھے وہ بہت اچھا لگا۔ Waiting for Godot اور اس قسم کے ڈرامے پڑھے اور ایک ڈرامہ— جس کی مجھ پر تہمت لگی کہ تم نے وہاں سے یہ افسانہ لیا ہے، وہ ڈرامہ میں نے بعد میں پڑھا۔ جب مجھے لگا کہ میں نے وہاں سے چوری کیا ہے تو اب وہ مجھے ضرور پڑھ لینا چاہیے۔ پھر میں نے اسے پڑھا تو واقعی میں خود حیران ہوا کہ جنہوں نے مجھ پر چوری کا الزام لگایا تھا وہ کچھ ایسے غلط نہیں تھے..... (ہنسی)

آصف فرخی: آئنسکو کا جو ڈرامہ ہے۔ ہاں اس میں مماثلت ہے لیکن آپ نے تو اس کا جو orignal تھا وہاں جا کر اس کو دیکھا۔ سنسکرت ڈرامے سے کچھ دلچسپی آپ کو نہیں رہی۔ حالاں کہ قدیم ہندو جو کہانیاں ان سے تو آپ نے بہت.....

انتظار حسین: بھئی بات یہ ہے کہ کالی داس کے ایک دو ڈرامے دیکھے تھے مگر کچھ زیادہ وہ

ڈرامے میرے ہتّھے چڑھے نہیں۔

آصف فرّخی: اچھا آپ نے ریڈیو کے ڈراموں کا بھی ذکر کیا۔ آپ کے کچھ ریڈیو کے ڈرامے تو چھپے ہوئے بھی ہیں۔ پانی کے قیدی چھپا ہوا ہے، نفرت کے پردے میں چھپا ہوا ہے—

انتظار حسین: پانی کے قیدی جو ہے، ٹی وی ڈرامہ ہے.....

آصف فرّخی: اچھا، تو یہ ٹی وی ڈرامہ تھا، تو ریڈیو کے کچھ اور ڈرامے آپ کو یاد ہیں۔

انتظار حسین: ریڈیو کا ڈرامہ میرے خیال میں میرا کوئی نہیں چھپا۔ یہ سب جو چھپے ہیں یہ ٹی وی ڈرامے ہیں۔

آصف فرخی: تو وہ ریڈیو کے ڈرامے کیا ہوئے؟ آپ نے خود چھپوانا پسند نہیں کیے؟

انتظار حسین: وہ میرے خیال میں ایسے ہی تھے۔ وہ میرے پاس محفوظ بھی نہیں ہیں۔

آصف فرّخی: ٹی وی کے لیے پہلا ڈرامہ آپ نے کب لکھا؟ کچھ یاد ہے؟

انتظار حسین: میں نے..... وہ مجھے اس حوالے سے یاد ہے کہ مجھ سے مختار صدیقی بہت کہتے رہے کہ ڈرامہ لکھو، ڈرامہ لکھو۔ میں نے لکھا نہیں۔ جب میری شادی ہوگئی اور میرے مسائل اقتصادی پیدا ہوئے تو میں نے مختار صاحب سے کہا کہ اب میں ڈرامہ لکھنا چاہتا ہوں تو انہوں نے کہا کہ ڈرامہ لکھو گے۔ تو میں نے ۱۹۶۶ء میں پہلا ڈرامہ لکھا۔

آصف فرّخی: یاد ہے کیا نام تھا۔ کیا ڈرامہ تھا؟

انتظار حسین: اب وہ مجھے یاد نہیں ہے کہ پہلا ڈرامہ کون سا لکھا تھا۔

آصف فرّخی: ٹی وی کے اور ڈرامے اپنے کون سے یاد ہیں آپ کو؟

انتظار حسین: ایک تو یہی ہے اور ایک میں نے لکھا تھا ''کباب ہاؤس'' ''اپنی آگ کی طرف'' تو یہ ڈرامہ تو میری کہانی سے ماخوذ تھا۔ کچھ کہانیوں کے حوالے سے میں نے ڈرامے لکھے ہیں۔ ''وہ جو کھوئے گئے'' کو ڈرامے کی شکل دی تھی۔ تو اس طریقے سے مختلف ہیں، اب عنوانات یاد نہیں رہے۔ کچھ ایسے مسائل ہیں مثلاً سماجی مسائل جو ہوتے ہیں۔ عورتوں کے حوالے سے کہ نئی عورتیں جس طریقے سے بزنس میں آ رہی ہیں، جاب کرنے جا رہی ہیں تو ان کے حوالے سے میں نے کچھ ڈرامے لکھے ہیں۔ ایک ڈرامہ مجھے یاد آ گیا جو لکھا تھا وہ نیشنل کونسل آف آرٹس نے لکھوایا تھا مجھ سے اور انہوں نے وہیں اسٹیج کیا۔ وہ لاہور میں اسٹیج نہیں ہوا، اسلام آباد میں ہوا تھا۔ ''پرانی لڑکیاں نئی عورتیں'' تو اس میں یہی مسئلہ تھا۔

آصف فرّخی: کباب ہاؤس تو مجھے یاد ہے کہ ایک کبابی ہے جس کی دکان کا کیسے ماڈرن فاسٹ فوڈ ریستوران بن جاتا ہے اس میں تو اس نے بالکل سامنے کا سماجی مسئلہ لیا ہے۔ اچھا ٹی وی کے لیے سیریل بھی لکھے ہیں آپ نے؟

انتظار حسین: اس کا نہ پوچھیے، ایک سیریل بچّوں کے لیے لکھی۔ ایک میں نے ناول کو Serialize کیا۔ بچوں کا سیریل تو خیر ٹھیک ہے، چل گیا، لیکن وہ کامیاب نہیں رہا۔ ہمارے دوست تھے۔ وہ ایک سیریل بنا رہے تھے انہوں نے کہا کہ صفدر میر سے لکھوا رہے ہیں ترگنیف کے فادرز اینڈ سنز کا سیریل۔ انہوں نے کہا تمہیں ترگنیف سے دلچسپی ہے۔ تو دوسرا ناول تو میں نے کہا اس کا جو دوسرا اہم ناول ہے A House of Gentry۔ میں نے کہا اسے کرالو۔ انہوں نے کہا کہ تم ہی کرو۔ مگر وہ بھی کامیاب نہیں رہا۔

آصف فرّخی: '' یہ غالباً وہ سیریل تھا..... ''زرد دوپہر''

انتظار حسین: ہاں، زرد دوپہر..... وہ کامیاب نہیں رہا۔

آصف فرّخی: کس حوالے سے؟

انتظار حسین: دیکھنے والوں کو پسند نہیں آیا۔ میرا خیال ہے کہ اس کی پروڈکشن ٹھیک نہیں تھی۔ اور میری تحریر میں بھی خامی ہوگی۔ کیونکہ سیریل لکھنے کا میرا کوئی تجربہ نہیں ہے اور پورے involvment کے ساتھ میں نے اسے لکھا بھی نہیں۔ میں بور ہوتا تھا۔ وہ زیادہ تر میرے خیال میں کامیاب اسی لیے نہیں تھا۔

آصف فرّخی: اچھا مجھے حیرت ہے کہ آپ نے اس ناول کا ترجمہ کیوں نہیں کیا۔ فادر اینڈ سنز کا جب اتنا اچھا آپ نے ترجمہ کیا ہے، تو ناول تو وہ بھی.....

انتظار حسین: وہ میری خواہش تھی کہ اسے بھی کروں مگر وقت نکل گیا تھا کہ جب میں ترجمے کر رہا تھا۔ کئی مرتبہ مجھے خیال آیا کہ اس ناول کا مجھے ترجمہ کرنا چاہیے۔ کئی مرتبہ میں نے دوستوں میں اعلان بھی کیا کہ میں اس ناول کا ترجمہ کر رہا ہوں مگر اس کی نوبت نہیں آئی۔

آصف فرّخی: وہ رہ گیا۔ وہ ہو جاتا تو اچھا تھا۔

انتظار حسین: ہاں، وہ رہ گیا۔

آصف فرّخی: اچھا، آپ نے ٹی وی ڈرامے ایسا لگتا ہے کہ ہاتھ روک روک کر لکھے ہیں، جب کہ ٹی وی ڈرامے کی ہمارے بہت سے افسانہ نگاروں کو ایک افادیت نظر آئی کہ ان کو ایک پیغام بھی لوگوں کو پہنچانے کا موقع ملا، کچھ مقبولیت بھی ملی، ڈرامے تو یقیناً اچھے لکھے، مگر افادیت سے اس سے سوا..... آپ نے یہ نسخہ استعمال نہیں کیا۔

انتظار حسین: پیغام پہنچانے کا تو مجھے شوق ہی نہیں ہے۔

آصف فرّخی: کیوں، کیا آپ کے پاس کوئی پیغام نہیں ہے؟

انتظار حسین: نہیں، میں یہ کہتا ہوں کہ ہم سب کی طرف سے پیغام علامہ اقبال دے گئے، وہ کافی ہے—(ہنسی)

آصف فرّخی: لیکن ٹی وی ڈراموں کے ذریعے تو حکمرانوں کا پیغام بھی پہنچایا جاتا رہا، یہ بھی ایک نسخہ رہا ہے۔

انتظار حسین: یہ حکمران کیا پیغام پہنچانا چاہتے ہیں اس پیغام سے بھی مجھے کبھی کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ اور میرے پاس اپنی طرف کوئی پیغام نہیں تھا قوم کے لیے، تو وہ بھی نہیں۔ ٹی وی ڈرامے کی پوری افادیت مجھ پر واضح نہیں ہوسکی۔ نہ یہ کہ مجھے محبِّ وطن بن کر پاکستان کے حوالے سے کوئی پیغام پہنچانا ہے، وہ بھی میں نہیں کہہ سکتا۔ اسلام کا پیغام بھی میرے پاس نہیں تھا، پھر بتایئے میں کیا کرتا۔

آصف فرّخی: ہاں پھر تو بڑی مشکل ہے۔ پھر تو آپ افسانے ہی لکھ سکتے ہیں۔

انتظار حسین: تو افسانے ہی لکھے ہیں میرے خیال سے.....(ہنسی)

آصف فرّخی: تو اپنے افسانوں کو جب آپ نے ٹی وی ڈراموں میں ڈھالا یعنی ''اپنی آگ کی طرف۔'' اور ''وہ جو کھوئے گئے'' تو کیا ان سے کامیاب ڈرامہ بنا۔ کامیاب یعنی دیکھنے والوں کے نقطہ نظر سے۔

انتظار حسین: دیکھنے والوں کے نقطۂ نظر سے کامیاب ڈرامہ بنا یا نہیں.....لیکن ایک آدھ ڈرامہ ایسا ہوا..... ہاں، ریڈیو کا ڈراما میں نے بنایا تھا—اس کا ''آخری آدمی''۔ تو وہ ان کا ہٹ ڈرامہ گیا اور وہ انہوں نے بار بار ری پیٹ (Repeat) کیا کئی مرتبہ ریڈیو پر۔ اگر کوئی میرا ڈرامہ کامیاب ہوا ہے تو وہ تھا۔ پروڈیوسر بھی مجھے بار بار بتاتا تھا کہ اس کا بہت response آیا ہے اور ہم اسے repeat کررہے ہیں۔ اور اس پر ایک ڈرامہ جس کا آپ ذکر کررہے ہیں، ٹی وی ڈرامہ جو ہے ''پانی کے قیدی''۔ میرا خیال ہے یہ وہ ڈرامہ ہے جسے میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ بہتر رہا اور یہ بھی ایک خاص سچویشن میں تھا۔ اس کا قومی صورتحال سے بھی ایک تعلق ہے۔ یہ ڈرامہ میں نے لکھا تھا ۷۰ء میں۔ تو آپ اس سیاق وسباق میں اس کھیل کو دیکھ سکتے ہیں۔

آصف فرّخی: تو یہ جو کھیل ہے اس کی فضا، اس کا treatment اس کا انداز، آپ کے افسانوں سے بہت ملتا جلتا ہے، اس اس دور کے جو افسانے ہیں.....

انتظار حسین: اسی لیے میں کہہ رہا ہوں.....وہ جو میری افسانہ نگاری ہے اس کے تسلسل میں یہ ڈرامہ لکھا گیا ہے۔

آصف فرّخی: آپ نے کیا اپنے ناول کو dramatize کرنے کا سوچا ہے، کسی ڈرامائی سیریل کے طور پر؟

انتظار حسین: نہیں، میرے خیال میں کم از کم میں تو اسے سیریل نہیں بنا سکتا اپنے ناول کو، بلکہ بمبئی سے ایک فرمائش بھی آئی تھی، اس خاتون نے مجھے بعد میں بتایا کہ میں علی سردار جعفری

کی بھانجی ہوں۔ تو انہوں نے کہا کہ ہم سیریل بنانا چاہتے ہیں۔ ''بستی'' اور ''آگے سمندر'' ہے کو ملا کر— میں نے کہا کہ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ انہوں نے کہا کہ ہم خود کچھ کرلیں۔ میں نے کہا کہ آپ جانیں، لیکن میں یہ نہیں کرسکتا، میرے لیے ممکن نہیں ہے۔

آصف فرّخی: یہ تو دو الگ کتابوں کو ملانے والی بات ہے۔

انتظار حسین: ہاں، لیکن میری سمجھ میں نہیں آیا۔ اور میرے ذہن میں یہ بات بھی آئی کہ یہ کوئی angling کریں گی..... ہندوستان کے حوالے سے، کیونکہ ان دونوں ناولوں کو ملایا تو کہیں نہ کہیں angling کی گنجائش ہے وہاں۔

آصف فرّخی: آپ نے خود نہیں کی.....

انتظار حسین: جو میں نے نہیں کی۔

آصف فرّخی: اچھا، تو کوئی اور ڈرامہ لکھنے کا ارادہ آپ کا ہے یا ڈرامہ سوچ رہے ہیں آپ؟

انتظار حسین: نہیں، اب نہیں، اب میں نہیں لکھ سکتا۔

آصف فرّخی: اچھا، ڈرامے سے لوگ اگلا قدم اٹھاتے ہیں پھر فلم کی طرف۔ کبھی فلم لکھنے کے بارے میں سوچا، کبھی آپ کو آفر آئی؟

انتظار حسین: اس کا بہت دلچسپ واقعہ ہے۔ ہاں میں نے ایک پلے کیا تھا ''بخت خان''۔

آصف فرّخی: ہاں، ''بخت خان'' بہت اچھا ڈرامہ تھا۔ میں اس کا ذکر بھول گیا تھا۔

انتظار حسین: ''بخت خان'' کو دیکھ لیا ایک فلم ساز نے بلکہ فلم ساز کی بیگم نے دیکھ لیا۔ وہ بھی فلم سازی میں ان کی شریک تھیں۔ تو ان کا پیغام آیا مجھے۔ تو ایک صاحب مجھے کار میں بٹھا کر لے گئے کہ وہ آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔ بہت مشہور فلم ساز ہیں رضوی صاحب.....کیا ہے نام ان کا؟ نام یاد آجائے گا.....تو انہوں نے کہا بخت خان سے مجھے بڑی دلچسپی ہے۔ ۱۸۵۷ء کے واقعات سے آپ مجھے ایک فلمی اسکرپٹ اس کی بنیاد پر لکھ دیں۔ تو انہوں نے کہا کہ ایک تو اس میں عشق کا واقعہ ہونا چاہیے پھر کسی شہزادے اور شہزادی کا عشق۔ میں نے کہا اچھا.....پھر کہا کہ ایک عشق بخت خان کا بھی ہونا چاہیے۔ میں نے کہا اچھا۔ انہوں نے کہا کہ مرہٹوں نے بھی جنگ میں شرکت کی تھی۔ کسی مرہٹن کے ساتھ عشق ہونا چاہیے۔ انہوں نے کہا کہ پھر کوئی عام سطح یعنی دھوبن، دھوبی اس قسم کا عشق جو ہے..... جب تین عشق اکٹھے ہوگئے تو میں بوکھلا گیا کہ ایک عشق دکھانا میرے لیے مشکل ہوگیا ہے، یہ تین عشق کیسے میں دکھاؤں گا، تو میں ان سے کہہ کر آیا.....

آصف فرّخی: اتنے عشق تو آپ کی پوری افسانہ نگاری میں نہیں ہیں.....

انتظار حسین: ہاں، اتنے عشق تو میری افسانہ نگاری میں نہیں ہیں (ہنسی) اس کے بعد ان کی طرف سے مجھے فون آتے رہے۔ میں نے کہا کہ میں لکھ نہیں سکتا۔ یہ فلمی دنیا کا فلم سازی کا مجھے

کوئی تجربہ نہیں ہے۔اس لیے مجھے معاف کر دیجیے۔ پھر اس طرف میں نے رُخ ہی نہیں کیا۔

آصف فرّخی: ہاں، یہ تو پھر پورا رہ گیا۔

انتظار حسین: پہلے جب انہوں نے کہا کہ کسی شہزادے شہزادی کا عشق دکھاؤ یہ تو مجھے سمجھ میں آیا، کسی دھوبی دھوبن کا عشق۔ مگر جب انہوں نے کہا کہ بخت خان کا کسی مراٹھن سے عشق دکھاؤ تو وہاں میں اٹک گیا.....(ہنسی)

آصف فرّخی: ہاں، یعنی عشق کی خاطر پوری تاریخ کو تو مسخ نہیں کیا جا سکتا۔ اچھا، اب ویسے ٹی وی چینلز پر بے انتہا ڈرامے بھی آ رہے ہیں تو اب یہ temptation نہیں ہوتا آپ کو کہ بعض لوگوں نے کہا کہ صاحب، افسانے کا دور گزر گیا اب تو ٹی وی ڈرامے کا دور ہے اور میڈیم جو ہے آج کا وہ ٹی وی ڈرامہ ہے۔ تو کیا آپ بھی یہ سمجھتے ہیں؟

انتظار حسین: نہیں، لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ ادب کا دور گزر گیا ہے، میڈیا کا دور ہے یہ۔ اور حد تو یہ بھی ہے کہ میڈیا جو ہے وہ اڑا کے لے گیا ہے لوگوں کو.....تو جو ہماری فیلڈ ہے ہم تو اسی میں جو کچھ بھی ہیں، ہمارا میدان، یا چراگاہ یا جو کچھ بھی ہے تو افسانہ ہے۔ اب وہاں میڈیا والے کیا چاہتے ہیں اور میڈیا کے ذریعے آپ کو کتنی شہرت اور کتنا پیسہ مل سکتا ہے، یہ تو ایک الگ معاملہ ہوا، لیکن ہمارا تو اوڑھنا بچھونا یہی ہے، اسی میں ساری زندگی گزری ہے۔ جو کچھ بھی کیا ہے ہم نے اسی فیلڈ میں کیا ہے۔

آصف فرّخی: لیکن لوگ میڈیا کی خاطر ڈرامہ نگار بھی بن گئے اور ادب کو بھی چھوڑ دیا۔

انتظار حسین: تو چھوڑ دیں.....

آصف فرّخی: تو ڈرامہ بھی ایک قسم کا temptation بن گیا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ ایک جوابی مضمون لکھوں، ''ہمارے ہاں افسانہ کیوں نہیں ہوتا''.....

انتظار حسین: وہ تو میں نے کہیں لکھا بھی ہے کہ ادب کا جو مسئلہ ہے وہ بڑا نازک اس لیے ہو گیا ہے کہ جب سے میڈیا آیا ہے آپ کو بہت temptation ملتے ہیں کہ جس کے ہاتھ میں قلم ہے وہ افسانے کیوں لکھے بلکہ ناول بھی کیوں لکھے کیونکہ اس میں تو نیکی کر دریا میں ڈال والا معاملہ ہے کہ آپ افسانے لکھے جا رہے ہیں، کس وقت آپ کا recognition ہوگا اور ہوگا بھی یا نہیں ہوگا، یہ تو ایسا کھیل ہے کہ جس میں کچھ پتہ نہیں چلتا۔ لیکن اگر ہاتھ میں قلم ہے اور تھوڑی آپ کے یہاں ذہانت ہے تو آپ دوسرے دن بہت مشہور پلے رائیٹر بن سکتے ہیں، تو لوگ اس طرف دوڑتے ہیں۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہ زمانہ رفتار کا زمانہ ہے، سب عجلت میں ہیں اور کہتے ہیں کہ جو کچھ بھی ہے بہت جلدی سے ہونا چاہیے، دولت حاصل کرنی ہے تو بہت عجلت میں، بہت جلدی سے۔ جس قدر جتنی دولت حاصل کر سکتے ہیں جلدی سے حاصل کرنا چاہ رہے ہیں، کوئی یہ نہیں کہ محبت

سے لگے ہوئے ہیں کہ رفتہ رفتہ ہم ترّقی کریں گے پھر کسی اپنے فن میں یا ملازمت میں مدارج طے کرتے ہوئے اپنے مقام تک پہنچیں گے۔ وہ تو کہتے ہیں جو ہونا ہے آج ہی ہو جائے۔ تو یہی لکھنے کی دنیا میں بھی ہے۔ اب ادب میں یہ نہیں ہو سکتا کہ یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کوئی افسانہ یہ سوچ کر لکھیں کہ فوراً کے فوراً مجھے کمال حاصل ہو جانا چاہیے۔ یا فوراً کے فوراً مجھے شہرت حاصل ہو جانی چاہیے۔ یہ ممکن ہی نہیں ہے ادب میں۔

آصف فرّخی: کمال اتنی جلدی حاصل ہوتا بھی نہیں ہے۔

انتظار حسین: ہوتا بھی نہیں ہے.....تو ہماری تربیت تو اس زمانے کی ہے، تو ہمیں اس قسم کا تصور اپیل ہی نہیں کرتا۔

آصف فرّخی: اچھا آپ نے دو ترجمے بھی کیے ہیں۔ ایک تو ''ہماری بستی'' اور مراٹھی کا جو افسانہ نگار ہے ٹنڈولکر اس کا بھی ایک ڈرامہ آپ نے کیا ہے، یہ ڈرامے اسٹیج بھی ہوئے ہیں۔

انتظار حسین: ٹنڈولکر کا ڈرامہ جو ہے وہ اسٹیج ہوا ہے۔ ہماری بستی اسٹیج نہیں ہوا۔

آصف فرّخی: ہاں وہ اسٹیج نہیں ہوا۔ بلکہ وہ ڈرامہ جو ہے ایک این جی او کی ہماری ایک دوست نے کہا آپ کوئی ڈرامہ لکھیں تو میں نے کہا ترجمہ کرا لیں۔ ٹنڈولکر کا پلے ایک ایسا مسئلہ ہے کہ آپ یہاں بھی پیش کر سکتے ہیں تو میں نے ڈرامہ ترجمہ کیا تھا تو تھوڑا سا adaptation کا مرحلہ کیا وہ بھی زیادہ نہیں کہ وہ کردار جو ہندو تھے انہیں مسلمان بنا دیا اور اسٹیج کر دیا۔

آصف فرّخی :لیکن وہ چھپا تو اپنی اور یجنل حالت میں ہے۔

انتظار حسین: چھپا اور یجنل ہے۔

آصف فرّخی: میرا خیال ڈرامے کے بارے میں ہماری فی الوقت باتیں تمام ہوئیں۔

۷ جولائی ۲۰۰۲ء

☆☆☆

قاضی عبدالستار (بھارت)　　باب پنجم: قسط پنجم

اردو شاعری میں قنوطیت

نظیر اکبر آبادی

(۱۷۳۰ء-۱۸۳۰)

نظیر کی شاعری کے بارے میں ایک فاضل کا ارشاد ہے۔

''نظیر کے کلام کو پڑھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک خوش دل اور شگفتہ مزاج رفیق مل گیا ہو جس کو انسان اور انسانی دنیا سے محبت ہے۔ جو انسان کی بے قدری نہیں کرتا۔ جو انسانی زندگی کی کم مائیگی کا احساس پیدا کرے دلوں کو افسردہ نہیں کرتا۔ جو اپنی رفاقت سے ہمارے اندر ایک تقویت پیدا کرتا ہے اور ہم کو یہ اطمینان دلاتا ہے کہ زندگی صرف دکھ درد کا نام نہیں ہے۔'' (۱)

اس بیان کا آخری فقرہ قابل لحاظ ہے۔ نظیر کے صدہا اشعار اُردو کی کلاسیکی شاعری کے انداز (قنوطیت) کی حامل ہیں۔ یہ بھی صحیح ہے کہ کلیات کا کافی حصہ ایسے کلام پر مشتمل ہے جس میں رجائیت جھلکتی ہے۔ لیکن یہ رجائی عنصر ان کی قنوطیت پر پردہ نہیں ڈالتا۔ پروفیسر آل احمد سرور نے اسی مسئلے کی طرف اشارہ کیا ہے۔

''نظیر کے یہاں بھرپور شوخ وشنگ، چلبلی اور دیوانی زندگی ملتی ہے۔ مگر وہ اس زندگی کے ناچ میں بھی اس ناچ کے اختتام کو نہیں بھولتے۔ ہم آپ اسے بھول جائیں مگر عوام بھی کبھی اسے نظر انداز نہیں کرتے اور نہ وہ اپنی اس سرزمین کو نظر انداز کرتے ہیں جس کے سینے پر ان کی کوششوں کے پھول کھلے ہیں اور جس کی بہاروں میں ان کا خون شامل ہے۔ ایک دفعہ آگرے میں بے روزگاری بہت سخت تھی سارے شہر میں سناٹا ہو گیا۔ نظیر نے اپنے ''شہر آشوب'' میں ان بے روزگاروں کا ماتم کیا ہے۔ یہ نظم نہیں اکبر آباد کی روح کی پکار ہے۔'' (۲)

نظیر کی شاعری کے اس پہلو کی پروفیسر اختتام حسین نے اس طرح وضاحت کی ہے۔

''(نظیر نے) موت۔۔۔خدا۔۔۔نیکی۔۔۔بدی۔۔۔فنا اور عقبیٰ سے ڈرا کر عیش ومسرت کی تخیلی لذت بھی ہم سے چھین لی۔ ایک طرف وہ صدا بلند کرتے ہیں:

دیکھ ٹک غافل چمن کو گلفشانی پھر کہاں

تو دوسری طرف دنیا پرستی کے خلاف وعظ کے ذریعے سے ترک دنیا پر آمادہ کر لیتے ہیں اور

بتاتے ہیں کہ ہر چیز کا انجام فنا ہے۔

سب جیتے جی کے جھگڑے ہیں سچ پوچھو تو کیا خاک ہوئے
جب موت سے آکر کام پڑا سب قصے قضئے پاک ہوئے

کی آواز آنے لگتی ہیں۔ اور جوانی کو جوانی کی طرح زندگی کو زندگی کی طرح بسر کرنے کا جو حوصلہ ہمارے اندر پیدا ہوا تھا وہ ہم میں باقی نہیں رہتا۔'' (۳)

ان بیانات کی روشنی میں اگر نظیر کے کلام کا مطالعہ کیا جوئے تو ہم اس کی قنوطیت کو ''عصری قنوطیت'' کہہ سکتے ہیں۔ نظیر بالطبع رجائی تھے، لیکن اپنی رجائیت کے چراغ تہ دامن کو حوادث روزگار کے طوفان سے محفوظ نہ رکھ پاتے تھے۔

پروفیسر شہباز کے بیان کے مطابق (۴) نظیر اکبر آبادی نے پوری ایک صدی زندہ رہ کر اس دار فانی سے ۱۸۳۰ء میں کوچ کیا۔ اس طور پر وہ ۱۷۳۰ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے ہوں گے۔ پروفیسر کی تحقیق کے مطابق نظیر نے ۱۷۵۶ء کے اوائل میں احمد شاہ ابدالی کی چڑھائی کے خوف سے دہلی کو خیر باد کہا۔ یعنی ابتدائی عمر کے پچیس سال نظیر نے اس دہلی میں گزارے جس کی سیاسی اور معاشی ابتری سے تاریخ کا ہر طالب علم واقف ہے۔ نظیر کی عمر کا بیشتر حصہ کم وبیش تین چوتھائی صدی آگرے میں گزارا جہاں دہلی کے خانماں برباد آباد ہو گئے تھے۔ تاریخی اور نیم تاریخی کتابوں کے مطالعے نے مغل آفتاب لب بام کا احساس دلایا ہوگا۔ آگرے پر سورج مل جاٹ کے حملے نے دنیاوی جاہ وحشمت کی بے ثباتی کا نقشہ پیش کر دیا ہوگا۔ اس کے علاوہ اردو شاعری پر فارسی افکار وروایات کا تاریخی اثر موجود ہی تھا۔ نظیر کی ابتدائی تربیت اپنے ماحول سے بیگانہ بھی نہیں رہ سکتی تھی پھر وہ صاحب نسبت ہونے کے علاوہ صاحب کرامات سمجھے گئے۔ ان حالات میں ان کی شاعری تصوف اور قنوطیت سے کسطرح بے نیاز رہ سکتی تھی۔

مگر نظیر کی غزل کی قنوطیت پر بحث کرنے سے پہلے ایک بات کا ذکر ضروری ہے میں نے نظیر کی قنوطیت کو ''عصری قنوطیت'' کہا ہے اس کے اسباب ہیں ان کی عشقیہ زندگی میں کوئی ایسا دکھ نہیں جس نے انھیں مایوس کر دیا ہو، ایسا کوئی حادثہ نہیں ملتا جس نے ان کے امیال وعواطف پر گہرا اثر ڈالا ہو۔ انھوں نے عشق نہیں کیا زندگی کے مزے لوٹے ہیں۔ ان کے ہجر کے بیان میں بھی وصل کی آسودگی ملتی ہے۔

آتے اس کو ادھر سنا جس دم　　آگئی انبساط جان کے بیچ
راہ دیکھی بہت نظیر اس کی　　پر نہ آیا وہ اس مکان کے بیچ

پان بھی پاندان میں بند رہے
عطر بھی قید عطر دان کے بیچ

اس طرح محبت کے پُرنشاط تذکروں کی بھی کمی نہیں ہے۔

دل کے لینے کا دکھ کے دل میں یاس　　آگیا ہ صنم ہمارے پاس

پہلے آنے سے اُس کے آتی ہے ہم کو اس زلف عنبریں کی باس
مل کے جب وہ چلا تو ہم نے کہا کل بھی گر تم نہ آئے بے وسواس
تو یہ خاطر میں یاد رکھئے گا ہے بند ہی ایک شے ہمارے پاس
جب نظیر اس نے ہم سے کھلوائی
تھی وہ کیا چیز۔۔۔ ریزہ، الماس

اس کے باوجود ان کے یہاں یاس حرمان سے بھرپور اشعار کی کمی نہیں ہے۔ غزلوں کے سرسری مطالعے سے بھی محبت کی کامرانی ملتی ہے۔

اے دل اپنی تو چاہ پر مت پھول دل بروں کی نگاہ پر مت پھول
عشق کرتا ہے ہوش کو برباد عقل کی رسم و راہ پر مت پھول
دام ہے وہ ارے کمند ہے وہ دیکھ زلف سیاہ پر مت پھول
واہ کہہ کر جو ہے وہ ہنس دیتا آہ اس ڈھب کی واہ پر مت پھول
گر پڑے گا نظیر کے مانند
تو زنخدان کی چاہ پر مت پھول

نظیر کا نظم سے فطری لگاؤ غزل میں قطعات بندی کا شاہد ہے۔ اُردو کے شاید ہی کسی شاعر کے دیوان میں قطعات کی اتنی بہتات ہو۔ یہی وجہ ہے کہ نظیر کی غزل رمزیت سے تقریباً بیگانہ ہے۔ لیکن جہاں کہیں انھوں نے غزل کے آداب کا احترام کیا ہے قنوطیت کی لے تیز ہوگئی ہے۔

نہ گل اپنا نہ خار اپنا نہ ظالم باغباں اپنا بنایا آہ کس گلشن میں ہم نے آشیاں اپنا
گلی کی خاک بھی ہوکر نہ ٹھہرنے پائے ہمیں تو آہ فلک یاں تلک نہ دیکھ سکا
گھڑی تو دل کو پرویا گھڑی جگر چھیدا کبھی خوشی مجھے وہ اک پلک نہ دیکھ سکا
اب تو ذرا سا گانوں ہے بیٹی نہ دے اسے لگتا تھا ورنہ چین کا داماد آگرا
عزیزو کیا پڑے سوتے ہو غفلت میں ذرا جاگو جرس فریادی دارد کہ بر بندیدہ محملہا
گو آتش گل بھڑکی ہے پر یہ نہیں توفیق پھونکے جو اسیران چمن کے قفسوں کو
سنو میں خون کو تو ساتھ لے آیا ہوں اور باقی چلے آتے ہیں اٹھتے بیٹھتے لخت جگر پیچھے
مرتا ہے جو محبوب کی ٹھوکر پہ نظیر آہ پھر اس کو کبھی اور کوئی لت نہیں لگتی
پکارا قاصد اشک آج فوج غم کے ہاتھوں سے ہوا تاراج پہلے شہر جان دل کا نگر پیچھے
منہ زرد آہ سرد و لب خشک و چشم تر سچی جو دل لگی ہے تو کیا کیا گواہ ہے
چمک ہے درد ہے کوندن پڑی ہے ہوک اٹھتی ہے مرے پہلو میں کیوں یارو یہ دل ہے یا کہ پھوڑا ہے
پیش جاتی نہیں ہر گز کوئی تدبیر نظیر

کام جب آن کے پڑتا ہے زبردستوں سے

مندرجہ بالا اشعار میں نظیر نے اپنے دور کے حالات وحوادث اور اپنے ادبی ورثے کے مروجہ رجحانات کی عکاسی کی ہے۔ ان کے کلیات میں ایسے مضامین کے اشعار کی کمی نہیں۔ اس کے علاوہ نظیر نے بھی میر اور دوسرے شعراء کی طرح غزل میں آنسو بہائے ہیں اور اس کے مضامین میں جدت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اشک افشانی اور قنوطیت میں جو ربط ہے اس پر گزشتہ صفحات میں بحث کی جا چکی ہے۔ یعنی آنسو زندگی اور دنیا کی بدی کے عرفان کا دوسرا نام ہے اور یہ عرفان قنوطیت تک پہنچاتا ہے۔ کچھ اشعار ملاحظہ کیجئے۔

لگی تھی آگ جگر میں بجھائی اشکوں نے اگر یہ اشک نہ ہوتے تو کیا ٹھکانا تھا
تھمانہ اشک نہ نیند آئی نا پلک جھپکی بسا ہے جب سے وہ خانہ خراب آنکھوں میں
نہ دن کو چین نہ راتوں کو خواب آنکھوں میں پھر آرہی ہے ترے غم سے آب آنکھوں میں
تمہارے ہاتھ سے کل ہم بھی رو لئے صاحب جگر کے داغ جو دھونے تھے دھو لئے صاحب
مری اس چشم تر سے ابر باراں کو ہے کیا نسبت کہ وہ دریا کا پانی اور یہ خون دل ہے برساتی
سر شک چشم سے موتی بہت پروئے گئے مگر یہ داغ جگر کے نہ ہم سے دھوئے گئے
مثال شمع کے جھٹ پٹ ٹپک پڑے آنسو سنا جو شوخ کے منہ سے کلام رخصت کا
کھول دی چاہ دیدۂ تر نے یاں نہ لازم پلک بھگونا تھا
اور جو ایسا ہی تھا تو گوہر اشک ہٹ کے اغبار سے پرونا تھا
جوں ملی چشم تر کف پا سے وہیں واں آبلے کا ہونا تھا
اشک تھا گرم تر نظیر اسے کچھ دم سرد سے سمونا تھا
برنگ اشک کبھی گر کے ہم نہ سنبھلے آہ یہی کہا کئے جی میں کہ اب سنبھلتے ہیں
دل ٹوٹا نظیر اب تو دو چار برس رو کر اس قصر شکستہ کی تعمیر ہے اور میں ہوں
ہمارے قطرۂ اشک اس کی سرد مہری سے
کسی زمانے میں موتی تھے اب تو اولے ہیں

ایسے بہت سے اشعار کلیات میں بکھرے پڑے ہیں جن سے زندگی کی نامرادی اور محبت کی دردمندی کا پتہ ملتا ہے جس نے نظیر کو تصوف سے قریب کر دیا۔ ہندو جاگیردار خاندانوں میں معلّمی نے انھیں ہندو نظام فکر و مذہب سے روشناس کرایا۔ یہ آشنائی نظیر کو ان مقامات پر لے گئی جہاں سے دنیا اور زندگی کے دکھ درد اس لئے ہیچ نظر آتے ہیں کہ خود یہ زندگی اور دنیا ہیچ ہے۔

وحدالوجود اور ہمہ اوست کے مسائل نے بیزاری اور جھنجھلاہٹ کے بجائے ان کے لہجے کو صوفیانہ اور مصلحانہ سنجیدگی عطا کی۔ انھوں نے بھی تصوف کے دوسرے علمبرداروں کی طرح ترک دنیا کا پیغام دیا۔ وحدۃ الوجود اور ہمہ اوست سے متعلق چند شعر سنئے۔

یہ کچھ بہروپ پن دیکھو کہ بن کر شکل دانے کی — بکھرنا جز ہونا لہلہانا پھر سمٹ جانا
یہ یکتائی، یہ یک رنگی تھی اوپر یہ قیامت ہے — نہ کم ہونا نہ بڑھنا اور ہزاروں گھٹ میں بٹ جانا
پھر کے نگاہ چار سو ٹھہری اس کے روبرو — اس نے میری چشم کو قبلہ نما بنادیا
فقط جو ذات کے ہیں دل سے چاہنے والے — انھیں کرشمہ و ناز ادا سے کیا مطلب

جدھر کو دیکھو ادھر آپ ہی جھمکتا ہے
مزا پڑے نہ اسے کیوں کہ شیش محلوں کا

تصوف کی اس منزل کے بعد معرفت نفس کی راہ پھوٹتی ہے۔ جہاں انسانی مجبوریوں اور ناکامیوں پر عزم وثبات کے حوصلے پست ہوجاتے ہیں۔

جو تو کہتا ہے اسے غافل یہ تیرا ہے یہ میرا ہے — یہ جس کا ہے اُسی کا ہے نہ تیرا ہے نہ میرا ہے
تری کیا ذات ہے کیا نام ہے کیا کام کرتا ہے — مسافر بے وطن ہے یا ترا اس جا پہ ڈیرا ہے
یہ چیزیں تو غرض کیا ہیں تو اپنا ہی نہیں مالک — تجھے او بیخبر نادان یہ کس غفلت نے گھیرا ہے
تو کچے سوت کا دھاگا عبث بل پیچ کھاتا ہے — یہ سب وہم غلط ہے اور قصور فہم تیرا ہے
نظیر اللہ اللہ اس جہاں میں دم غنیمت ہے — کہاں ہم اور کہاں پھر تم کہ یہ دم کا بسیرا ہے
خواب عدم میں ہم تو فراغت سے اے نظیر — سوتے تھے عشق نے آکر مگر جگا دیا
عشق میں اس گوہر نایاب کے — آج تلک خشک ہیں دریا کے لب
میں ہوں پتنگ کاغذی ڈور ہے اُس کے ہاتھ میں — چاہا ادھر گھٹا دیا چاہا ادھر بڑھا دیا

محو تدبیر ہیں ہم لیک خدا ہی جانے
کون سا گل ہے پس پردہ تقدیر کھلا

سلوک اور معرفت کی ان راہوں میں تاریخی جبریت نے دنیا کی ساری عشرتوں اور کلفتوں کا نقاب اتار کر موت کا منہ کھول دیا۔ دنیا اور زندگی کی رہی سہی قیمت بھی گر گئی۔

کل جو گزرے تھے ہم اک کہنہ مزارستان میں — واں عجب طور کی عبرت سے ہم آغوش ہوئے
یعنی اک شخص یہ بولا کئی یاں عظم دھن — سخت بوسیدہ نگہ سے مری ہم دوش ہوئے
مجھ سے یوں کہنے لگے جن کے ہیں یہ عظم ومیم — وہ بصد عیش وطرب خوش خور وخوش پوش ہوئے
رات دن فرصت وعشرت میں بسر کرتے تھے — کبھی گلشن میں پھرے اور کبھی مئے نوش ہوئے
ایک دم چرخ حسد پیشہ سے مانند چراغ — دیر پل بھر نہ لگی آہ جو خاموش ہوئے

اب کوئی نام ونشاں سے نہیں آگاہ
ایسے وہ خاطر عالم سے فراموش ہوئے

عام انسانوں پر موت کی سفاک گرفت کے ساتھ ساتھ جب وہ شہر یاروں اور کج کلاہوں

کے پیروں میں بھی اسی زنجیر کے زخم دیکھتا ہے تو دنیاوی جاہ وجلال کی کوئی وقعت نظر میں باقی نہیں رہ جاتی۔

یہ جواہر خانۂ دنیا جو ہے با آب و تاب — اہل صورت کا ہے دریا اہل معنی کا سراب
وہ عظیم الشان مکاں دیتی تھیں جن کی رفعتیں — ہنس کے طاق آسمان کو طاق ابرو سے جواب
ان میں تھے وہ صاحب ثروت جنھیں کہتے تھے لوگ — کیقباد و قیصر و کے خسرو و افراسیاب
ہر طرف فوج بتاں ہر سو ہجوم گلرخان — جن کے عارض رفع ماہ ورشک روے آفتاب
جو وہ سب جاتے رہے دم میں حباب آسا مگر — رہ گئے عبرت فزا وہ قصر ویراں و خراب

ہیں اگر دو خشت باہم تو لب افسوس ہیں
اور جو کوئی طاق ہے تو صورت چشم پر آب

اسی عبرت وعرفان کے ہاتھوں وہ نفی کائنات کے قائل ہوجاتے ہیں۔

دنیا ہے ایک نگار فریندۂ جلوہ گر — الفت میں اس کی کچھ نہیں جز کلفت وضرر
لینے کو نقد عمر کے شیریں ہے مثل قند — جب لے چکے تو ہوتی ہے حنظل سے تلخ تر
جو اس سے دل لگانے میں آخر ہو منفعل — ملتے ہیں اپنے دست تاسف بیک دگر

سب اس نگار خانے کو تو بھی اسی نمط
سیر مسافرانہ کر اور اس سے در گز

نظیر کی قنوطی لے ان کی نظموں میں زیادہ واضح ہے۔ نظم تفصیل، تعمیر اور تنظیم پر زور دیتی ہے۔ غزل کے فن میں ان عناصر کا فروغ نہیں۔ نظیر نظم کے لئے پیدا ہوئے تھے۔ ان کی نظمیں جوش بیان اور قدرت زبان کے علاوہ اپنے اجزائے ترکیبی کے لحاظ سے مکمل ہیں۔ کلیات میں ایسی نظموں کا ایک بڑا سلسلہ موجود ہے جو قنوطی اثرات ونتائج سے مملو ہیں لیکن ایسی نظمیں بھی ہیں جو اپنے مواد کے لحاظ سے رجائی ہیں مگر ان میں قنوطیت کی رنگ آمیزی نظر آتی ہے۔ ''کلمہ محمد ﷺ'' میں نظیر نے کلمے کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے جو تصویریں پیش کی ہیں ان میں قنوطیت کا رنگ جھلکتا ہے۔

اسی کلمے نے عزرائیل کی ہیبت کو ٹالا ہے — اسی کلمے نے تنگی کو لحد کی کھول ڈالا ہے
پڑے گا قبر کا تجھ پر میاں وہ دن جو کالا ہے — یہی کلمہ ترا واں بھی اندھیرے کا اُجالا ہے

پڑھا کر صدق دل سے رات دن کلمہ محمد ﷺ کا

میاں جب پُل صراط اوپر تو اپنا پیر ڈالے گا — تو وہ تلوار کی ہو دھار تیرا پانوں کھا لیگا
سوا نیزے کے اوپر جب کہ ہوگا آفتاب آیا — ہر ایک گرمی کی تابش سے پھرے گا سخت گھبرایا

پڑھا کر صدق دل سے رات دن کلمہ محمد ﷺ کا

منقبت حضرت علی علیہ السلام میں نظیر نے ان کی شفاعت کا مژدہ سنا کر قبر وقیامت کی مصیبتوں کا ذکر چھیڑ دیا ہے۔

کہا اس شاہ نے روز قیامت میں جو آونگا وہاں عرفات میں اپنے محبونکو جو پاؤں گا
کھڑا ہو عرش کے آگے سبھوں کو بخشواؤ نگا پلا کر جام کوثر سبکو جنت میں پہونچواؤ نگا
علی کے دوستو سن لو شفاعت اس کو کہتے ہیں

عید کے نشاط آگیں موضوع پر نظیر کا رنگ دیکھئے۔

یوں لب سے نکلے ہے اب بار بار آہ کرتا ہے جس طرح کہ دل بیقرار آہ
عالم نے کیا ہی عیش کی لوٹی بہار آہ ہم سے تو آج بھی نہ ملا وہ نگار آہ
ہم عید کے بھی دن رہے امیدوار آہ

''ہولی'' میں نظیر نے انتہائی جوش بیان کے ساتھ لذت پرستی کا اظہار کیا ہے۔ لیکن اگر اس کے بندوں کا تجزیہ کی جائے تو اس لذت کے نیچے قنوطیت کی پرچھائیں نظر آئے گی۔

یہ وقت خوشی کا ہے مت کام رکھو رم سے لے رنگ گلال اے جان اور ناز کی خم جم سے
ہنس ہنس کے بہم لپٹیں اس عیش کے عالم سے ہم چھوڑ ''کہیں تم سے اور تم چھوڑ'' کہو ہم سے
ہولی میں یہی دھومیں لگتی ہیں بہت بھلیاں

یہاں ''یہ وقت خوشی کا ہے'' کا ٹکڑا ایک طرف تو پچھلے غموں کی کہانی کہتا ہے اور دوسری طرف اپنے اوپر خوشی لا دلینے کی آرزومندی کا اظہار کرتا ہے۔ پورے بند میں جستجو و آرزو کی گرمی، بیان ان کی محرومی کی غماز ہے۔ ''بڑھاپا'' کے تقریباً تمام اشعار عمر رفتہ کے سوگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

جب عیش کے مہماں تھے اب غم کے ہوئے ضیف اب خون جگر کھاتے ہیں تب پیتے تھے سو کیف
جب اینٹھ کے چلتے تھے سپر باندہ اٹھا سیف اب ٹیک کے لاٹھی کے تئیں چلتے ہیں صد حیف
سب چیز کو ہوتا ہے برا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

تھے جیسے جوانی کے چڑھے زور میں سرپخ ویسے ہی بڑھاپے کی پڑی آن کے اب پخ
نکلا ہوا تن سوکھ روئی بال رگیں پخ حلوا ہوئے چرخا ہوئے لپی ہوئے پخ
سب چیز کو ہوتا ہے برا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

''بہار'' پر جو نظم ہے اس میں بھی نظیر نے طربیہ تصویریں بنا بنا کر بگاڑ دی ہیں۔ ''بہار''

جی پہ خوشی کے در کھلے رنج و لقب کے حوصلے شوخ کے ناز چلبلے بوسوں کے تھے معاملے
اس میں رقیب دم نہ لے بولا ہی کر کے اشغلے باندھ کمر مسافرو کوچ کریں ہیں قافلے
صبح کے ڈر سے ہڑبڑا یار نے گھر کی راہ لی
ہم بھی دغا میں آگئے مفت بہار لٹ گئی

''چاندنی'' اور ''جھڑی'' جیسی نشاطیہ نظموں کی تان بھی حسرت و یاس پر ٹوٹتی ہے۔ (چاندنی)

کیا ہی مزے سے عیش کی رات تھیں کامیابیاں چھوٹی تھیں ماہتاب کی نہروں میں ماہتابیاں
آگے چنی تھیں صف بہ صف مئے کی گئی گلابیاں ہم کونشوں کی مستیاں یار کو نیم خوابیاں
سینوں میں اضطرابیاں آنکھوں میں بے حجابیاں اس میں فلک نے رشک سے ڈالیں یہ کچھ خرابیاں
صبح ہوئی گجر بجا پھول کھلے ہوا چلی
یار بغل سے اٹھ گیا جی ہی میں جی کی رہ گئی

چار طرف سے ابر کی واہ اٹھی تھی کیا گھٹا بجلی کی جگمگاہٹیں رعد رہا تھا گڑ گڑا
برسے تھا مینہ بھی جھوم جھوم چھاجوں اماڈ پڑا جھوکے ہوا کے چل رہے یار بغل میں لوٹتا
ہم بھی ہوا کی لہر میں پیتے تھے مئے بڑھا بڑھا دیکھ ہمیں اس عیش میں سینہ فلک کا پھٹ گیا
ابر کھلا ہوا گھٹی بوبدیں تھمیں سحر ہوئی
پہلو سے یار اٹھ گیا سب وہ بہار بہ گئی

بعض اوقات قنوطیت کے سبب سے نظیر طربیہ نظموں کا حق ادا نہیں کر سکے ہیں۔ ''بارات کی بہاریں'' کا موضوع اور مخمس کا آخری مصرعہ۔

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

تقاضا کرتا ہے کہ ساری نظم نشاطیہ ہو۔ اکثر جگہ نظیر نے اس احساس کا احترام کیا ہے لیکن بے پناہ نہیں بنا سکے ہیں۔ ''برسات کی بہاریں''۔

اب برھنوں کے اوپر ہے سخت بیقراری ہر بوند مارتی ہے سینے اپر کٹاری
بدلی کی دیکھ صورت کہتی ہیں باری باری ہے ہے نہ لی پیانے اب کے بھی سدھ ہماری
کیا کیا مچی ہیں یاروں برسات کی بہاریں

کتنوں نے اپنی غم سے اب ہے یہ گت بنائی میلے کچیلے کپڑے آنکھیں بھی ڈبڈبائی
نے گھر میں جھولا ڈالا نے اوڑھنی رنگائی پھوٹا پڑا ہے چولھا ٹوٹی پڑی کڑھائی
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

اب تک ان نظموں میں سے کچھ کی قنوطیت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو اپنے موضوع اور انداز بیاں کے لحاظ سے رجائی ہیں۔ کلیات میں ایسی نظموں کا پورا ایک باب ہے جو اپنے خیال اور بیان دونوں اعتبار سے کلیتہ قنوطی ہیں۔

آگرے میں قحط پڑا۔ مفلسی اور بے روزگاری نے گھروں میں جھاڑو پھیر دی۔ تمام پیشوں کے کاروبار بند ہوگئے۔ نجیبوں کی آبرو لٹ گئی۔ غریبوں کی زندگی اجیرن ہوگئی۔ نظیر نے شاعر کے تاریخی منصب کا احترام کیا۔ پورے شہر و سماج کے تمام درد و داغ اپنے الفاظ میں قید کر لیئے۔ ساری نظم پر

مایوسی کی گھٹا چھائی ہے خوشی کی کرن کا دُور دُور نشاں نہیں۔ نظم کا ہر بند سودا کے ''شہر آشوب'' اور میر کے مرثیوں کی یاد دلاتا ہے۔

بے روزگاری نے یہ دکھائی ہے مفلسی — کوٹھے کی چھت نہیں ہے یہ چھائی ہے مفلسی
دیوار و در کے بیچ سمائی ہے مفلسی — ہر گھر میں اس طرح سے پھر آئی ہے مفلسی
پانی کا ٹوٹ جاوے ہے جو ایک بار بند

صراف بنئے جوہری اور سیٹھ ساہوکار — دیتے تھے سب کو نقد سو کھاتے ہیں اب ادھار
بازار میں اڑے ہے پڑی خاک بیشمار — بیٹھے ہیں یوں دکانوں پہ اپنی دوکاندار
جیسے کہ چور بیٹھے ہوں قیدی قطار بند

کیا چھوٹے کام والے وہ کیا پیشہ ور نجیب — روزی کے آج ہاتھ سے عاجز ہیں سب غریب
ہوتی ہے بیٹھے بیٹھے جب آشام عن قریب — اٹھتے ہیں سب دکان سے کہہ کر کے یا نصیب
قسمت ہماری ہوگئی بے اختیار بند

نظیر نے دنیا کو دھوکے کی ٹٹی قرار دے کر سارے بیانات کی تصدیق کر دی جو زندگی کے بارے میں اُن کے پیش رو کہہ گئے تھے۔ ''دنیا دھوکے کی ٹٹی ہے''

کوئی تاج خریدے ہنس ہنس کر کوئی تخت کھڑا بنواتا ہے — کوئی کپڑے رنگے پہنے ہے کوئی گدڑی پہنے جاتا ہے
کوئی بھائی باپ چچا نانا کوئی دادا پوتا کہاتا ہے — جب دیکھا خوب تو آخر کو نسے رشتہ ہے نے نانا ہے
غل شور بیولا آگ ہوا اور کیچڑ پانی مٹی ہے
ہم دیکھ چکے اس دنیا کو یہ دھوکے کی سی ٹٹی ہے

اب کس کا رنگ برا کہئے اور کس کا روپ بھلا کہئے — اک دم کی پیٹھ لگی ہے یہ انبوہ مزا چرچا کہئے
یہ سیر تماشے دیکھ نظیر اب جا کہئے بے جا کہئے — کچھ بات نہیں بن آتی ہے چپ چاپ پہیلی کیا کہئے
غل شور بگولا آگ ہوا اور کیچڑ پانی مٹی ہے
ہم دیکھ چکے اس دنیا کو یہ دھوکے کی سی ٹٹی ہے

دنیا کے بارے میں نظیر کا یہ نقطۂ نظر بہت کچھ نظیر کے صوفیانہ مسلک کا رہین منت تھا۔ عہد نظیر کے کسی بھی بڑے شاعر کو لے لیجئے۔ حاتم، مظہر، آبرو، آرزو سودا، میر سب کسی نہ کسی خانوادے سے منسلک ملتے ہیں۔ نظیر تو خود صاحب ہدایت تھے۔ خلیفہ گلزار علی ان کی ولایت کے قایل تھے۔ اس قیاس کا ثبوت ان کے کلیات کی متعدد نظمیں ہیں۔ ''فنا'' تصوف کا اہم باب ہے نظیر اس دروازے سے بھی گزرے ہیں۔

اس دنیا کے دھن دولت میں شاہ سلیمان جاہ چلے — یاں ٹھہرے میر وزیر اعظم یا راجہ بن کر آہ چلے
منہ دیکھا اجل کے لشکر کا تب لے کر گھر کی راہ چلے — نے ہاتھی گھوڑے سنگ چلے نے تخت چھتر ہمراہ چلے
سب جیتے جی کے جھگڑے ہیں سچ پوچھو تو کیا خاک ہوئے
جب موت سے آکر کام پڑا سب قصے قضئے پاک ہوئے

سب چھوڑ فقیر آزاد ہوئے یا دنیا داری لوٹ گئے — یا شال دوشالے اوڑھ پھرے یا اجلے پیوند گوٹ گئے
سنگ اور فضا کے سونٹے نے سر دونوں کے جب پھوٹ گئے — یاں سیلی تا کے ٹوٹ گئے واں جالے تن کے چھوٹ گئے
سب جیتے جی کے جھگڑے ہیں سچ پوچھو تو کیا خاک ہوئے
جب موت سے آکر کام پڑا سب قصے قضئے پاک ہوئے

''فنا'' کے عنوان سے دوسری نظم بھی اسی قنوطیت کی صدائے بازگشت ہے۔

ہے آدمی کی ذات کا اس جا بڑا ظہور — لے عرش تا بفرش چمکتا ہے جسکا نور
گزرے ہے ان کی قبر پہ جب وحش اور طیور — رو رو یہی کہے ہے ہر اک قبر کے حضور
جو خاک سے بنا ہے وہ آخر کو خاک ہے

اس راہبانہ صوفیت کا عکس ان کی نظم ''تنبیہ اللغافلین'' میں ملتا ہے۔ ''تنبیہ اللغافلین''

جہاں ہے جب تلک یا سینکڑوں شادی و غم ہوں گے — ہزاروں عاشق جانباز ہوں گے اور صنم ہوں گے
کنار و بوس اور عیش و طرب بھی دم بدم ہوں گے — مگر جتنے یہ اپنی صف کے ہیں یہ سب عدم ہوں گے
نہ یہ چہلیں نہ یہ دھومیں نہ یہ چرچے ہم ہوں گے
میاں اک دن وہ آوے گا نہ تم ہوگے نہ ہم ہوں گے

دنیاداروں کی دنیاداری پر نظیر نے آنسو بہائے ہیں۔ ''خواب غفلت'' میں انھیں آنسوؤں کا سراغ ملتا ہے۔

جب پالکی میں چڑھ کے چلا آپ کا بدن — کلمہ نقیب پڑھتے چلے ساتھ کر پھبن
تو بھی یہ کہتے تھے کہ ہوا کون بے وطن — جب آئے اس گڑھے میں نظر اور ہزار من
اوپر سے آگے خاک پڑی تب خبر ہوئی

جب دنیا ہیچ ہے اور اس کا انجام موت ہے تو اس کے دکھ بھی سکھ کی طرح عارضی ہیں۔ انسان کے بس میں کیا ہے۔ تدبیر تقدیر کے سمندر کا ایک تنکا ہے۔ ''کوئی امید بر نہیں آتی'' اس خون آرزو سے نظیر نے ''توکل'' کے نقوش تیار کئے ہیں۔ نظیر نے اپنی زندگی میں اس توکل پر عمل بھی کیا ''دربار اودھ'' کی دعوت اس توکل سے رد کر دی اور معیشت کی فکروں سے منہ موڑ لیا۔ ممکن ہے نظیر کی شخصیت میں اسی ''توکل'' نے راستی پیدا کی ہو لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اس کے چکر میں قوموں کا اقبال گہنا جاتا ہے۔ ''توکل''

اے دل کہیں تو جا کے نہ اپنی زبان ہلائے — اور درد اپنے دل کا کسی کو تو مت سنائے
مانگ اس سے جس کے ہاتھ سے تو پیٹ بھر تو کھائے — مشہور یہ مثل ہے کہوں کیا میں تجھ سے ہائے
غیر از خدا کے کس میں ہے قدرت جو ہاتھ اٹھائے — مقدور کیا کسی کا وہی دے وہی دلائے

توکل سماجی عوامل کی رفتار مدھم کرتا ہے۔ رہبانیت سے اس کی قربت ہوتی جاتی ہے۔ ترک و تجرید کے شگوفے پھوٹتے ہیں اور قنوطیت کے چمن کھلتے ہیں۔ نظیر خود اس کے شاہد ہیں۔ اپنی نظم ''توکل ترک و تجرید'' میں ارشاد کرتے ہیں۔

یہ صورتیں جو دیکھے ہے مت ان سے دل لگا — بریں ہیں سوتیاں انھیں اے یار مت جگا
شجرہ کلاہ پھینک اڑادے چھگا۔۔۔تگا — آگے کو چھوڑ ناتھ نہ پیچھے کو رکھ پگا
گر ہے فقیر تو تو نہ رکھ یاں کسی سے میل — یاں تو نبڑی نہ نبیل پڑا اپنے سر پہ کھیل
یہ النیتی کہ ساتھ ترے آٹھ پہر۔۔۔ ہیں — یہ النیتی نہیں ہیں مری جان قہر ہیں
جتنے یہ شہر دیکھے ہیں جادو کے شہر ہیں — جتنی مٹھائیاں ہیں مری جاں زہر ہیں

گر ہے فقیر تو تو نہ رکھ یاں کسی سے میل
اں تو نبڑی نہ نبیل پڑا اپنے سر پہ کھیل

کلیات نظیر کی بہت سی نظمیں ایسے ہی معانی ومطالب کی حامل ہیں جنھیں سہواً نظر انداز کیا گیا ہے مثلاً۔

موت: دنیا میں اپنا جی کوئی بہلا کے مرگیا۔
دنیا میں استغنا: کی اصل میں دلبر نے عنایات تو پھر کیا۔
دنیا کے مراتب قابل اعتبار نہیں: گر شاہ سر پہ رکھ کر افسر ہوا تو کیا۔
مراتب دنیا محض بے ثبات ہیں: گر بادشاہ ہو کر عملی ملکوں ہوا تو کیا ہوا۔
فقیروں کی صدا: زر کی جو محبت تجھے پڑ جائے گی بابا۔
فقیروں کی صدا: بٹ مار اجل کا آپہونچا ٹک اس کو دیکھ ڈرو بابا۔
بنجارہ نامہ: ٹک حرص وہوا کو چھوڑ میاں مت دیس بدیس پھرے مارا۔
جھونپڑا: یہ تن جو ہے ہر اک کے اتارے کا چھونپڑا۔
رہے نام اللہ کا: دنیا میں کوئی خاص نہ کوئی عام رہے گا۔
عاشقوں کی بنگ: کیوں عبث بیٹھا ہے ڈالے کان میں غفلت کا تیل۔
تسلیم ورضا: جو فقر میں پورے ہیں وہ ہر حال میں خوش ہیں۔
آئینہ: لے آئینے کو ہاتھ میں اور بار بار دیکھ۔
دنیا دارالمکافات ہے: ہے دنیا جس کا ناؤں میاں یہ اور طرح کی بستی ہے۔

حوالہ جات:

۱۔ مجنوں گورکھپوری: ''نگار''، نظیر نمبر، جنوری ۱۹۳۰ء، ص ۲۲، ۲۳۔
۲۔ پروفیسر آل احمد سرور: ''ادب اور نظر یہ''، ص ۷۳، ۷۴۔
۳۔ احتشام حسین: ''تنقیدی جائزے''، ص ۱۸۳۔
۴۔ پروفیسر شہباز: ''زندگانی بے نظیر''۔

پروفیسر رضی عابدی

ایبسرڈ - ماورائے عقل

ایبسرڈ کے لغوی معنی غیر معقول اور لایعنی کے ہیں، لیکن ایک نظریۂ حیات کے حوالے سے اس کے معنی احمقانہ یا مضحکہ خیز کے نہیں ہیں۔ اس کا مطلب ہے سمجھ سے ماورا۔ یہ ایک بہت پرانا نظریہ ہے جسے مغرب نے حال میں ہی دریافت کیا ہے۔ یہ اس بات کا اعتراف ہے کہ زندگی کو سمجھا نہیں جا سکتا اور چنانچہ اس کے متعلق کوئی پیشین گوئی ممکن نہیں ہے۔ اس کا واضح سبب یہ ہے کہ زندگی کے طریقے انسانی ذہن کی دسترس سے باہر ہیں۔ انسانی ذہن سائنسی طریقے پر کام کرتا ہے اور سائنس کی بنیاد تجربے پر ہے جو بہت محدود ہے جبکہ حقیقت بہت وسیع ہے۔ لینن نے کہا تھا کہ حقیقت ہمارے علم کی حد ہے اور اس میں وسعت ہوتی رہتی ہے۔ ہوائی جہاز اور کمپیوٹر ایک عرصے پہلے تک حقیقت نہیں تھے۔ جو سائنسی حقیقت یقین رکھتے ہیں وہ کسی ایسی بات کو نہیں مانتے جسے ثابت نہ کیا جا سکے۔ چنانچہ لاادری (Agnostics) پر برٹرینڈ رسل کی طرح یہ کہتے ہیں کہ خدا کے وجود کو سائنسی طریقوں سے نہ تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ نہ اس کا انکار کیا جا سکتا ہے۔ البتہ ایک علم غیب بھی ہے۔ یہ علم غیر مصدقہ ہے اور مخصوص لوگ مخصوص طریقوں سے اس تک پہنچ سکتے ہیں۔ عقیدہ کا تعلق عقل سے نہیں ہے، لیکن یہ اس حقیقت تک پہنچتا ہے جہاں عقل کی رسائی نہیں ہے۔ مغربی ذہن کی نشوونما سائنسی طریقے پر ہوئی ہے۔ چنانچہ یہ کسی ایسی بات کو نہیں مانتا جس کی سائنسی تصدیق نہ ہو۔ چنانچہ ہر وہ بات جہاں تک سائنس نہ پہنچ سکے اسے لایعنی قرار دے دیا جاتا ہے۔ اسی پر بیسویں صدی کے وسط میں یورپ اور امریکہ میں تھیٹر آف دی ایبسرڈ کی بنیاد پڑی۔

مغرب میں ایبسرڈ کا تصور ایسے ہی نازل نہیں ہو گیا۔ یہ انہیں تلخ تجربوں کے ذریعہ حاصل ہوا۔ جن سے انہیں احساس ہوا کہ عقل نے انہیں فریب دیا ہے۔ یہ احساس انہیں خون خرابے اور کبھی ختم نہ ہونے والی انسانی مصیبتوں سے ہوا۔ بیسویں صدی میں دو عظیم جنگیں اور ان کے اثرات نے علاوہ اور باتوں کے نہ صرف ان کی تہذیب اور ثقافت پر کاری ضرب لگائی بلکہ ان کے ذہنوں کو بھی جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ انہیں محسوس ہوا کہ صرف مغرب ہی نہیں بلکہ ساری دنیا مکمل تباہی کے دہانے پر آ کھڑی ہوئی ہے۔ عقل کی حقیقت سے انکار ممکن نہیں تھا۔ عقل کی بدولت ہی انہوں نے زبردست ترقی کی تھی اور عقل ہی نے انہیں بتایا تھا کہ عقل ناکافی ہے، لیکن جنگوں نے انہیں یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ انسان نے بہت غلطیاں کی ہیں اور یہ تمام ترقی ترقیِ معکوس ہے۔ آدمی پہلے سے کہیں زیادہ وحشی ہو گیا۔ زندگی کو محفوظ اور پُرسکون بنانے کے لیے انسان نے جتنی کوششیں کیں اتنی ہی زندگی تکلیف دہ اور غیر محفوظ ہوتی گئی۔ اس سے دو نتیجے نکلے:

یا تو انسان کی عقل بھٹک گئی یا پھر زندگی دائرۂ عقل سے باہر ہے۔ یعنی ایبسرڈ ہے۔ اتنی کامیابیوں کے بعد عقل کو موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا تھا۔ سائنس اور ٹیکنالوجی میں عقل کے کارنامے حیرت ناک تھے۔ چنانچہ فیصلہ ایک ہی ٹھہرا کہ زندگی ایبسرڈ ہے۔

یہ کہ عقل نے ہی عقل کی نارسائی کو ثابت کیا ہے مندرجہ ذیل باتوں سے عیاں ہے:

۱۔ زندگی کو جانا ہی نہیں جا سکتا۔ اس لیے کہ کسی چیز کو جاننے کے لیے اس کی مکمل پہچان ضروری ہے۔ جزو سے کبھی کل کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ شیشے کے ایک ٹکڑے سے یہ جاننا مشکل ہے کہ یہ کسی پیالے کا ٹکڑا ہے یا پلیٹ کا۔ زندگی اَزل سے اَبد تک پھیلی ہوئی ہے۔ ۵۰۰۰ برس کی زندگی جس کا ہمیں کسی حد تک اندازہ ہے۔ ۷۰ یا ۸۰ برس کے تجربہ سے سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ جبکہ زندگی اس سے بھی کہیں زیادہ قدیم ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پوری زندگی کا احاطہ کبھی بھی ممکن نہیں ہے۔

۲۔ کسی چیز کو جاننے کے لیے اس سے باہر ہونا ضروری ہے جو خود ہجوم کے اندر ہوا سے ہجوم نظر نہیں آتا۔ زندگی میں رہتے ہوئے زندگی کو سمجھنا ممکن نہیں ہے۔

۳۔ ہم چیزوں کو اپنے شعور سے جانتے ہیں، لیکن شعور خود کو نہیں جان سکتا۔ ہمیں چیزیں اس لیے نظر آتی ہیں کہ ان کا عکس ہمارے ذہنوں پر پڑتا ہے، لیکن ہمیں یہ بھی پتہ ہے کہ ذہن خود بخود بھی تصویریں بناتا ہے۔ مثلاً خواب میں یا تخیل میں۔ ہمارا تخیل تو ہمیں وہ بھی دکھاتا ہے جو نہ کبھی ہوا ہے اور نہ کبھی ہوگا۔ ہمارے پاس کوئی ایسا آلہ نہیں ہے جو یہ بتا سکے کہ کون سی تصویریں اصل کی نقل ہیں اور کون سی ذہن کی تخلیق۔ اس سے یہ شک بھی پیدا ہوتا ہے کہ خارجی دنیا ہے بھی یا نہیں۔ اسے فلسفہ کی زبان میں ہمہ اوست (solipsism) کہتے ہیں یعنی ذات یا نفس کے علاوہ کوئی موجود نہیں۔

سنی حکایتِ ہستی تو درمیاں سے سُنی نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

اور اسی پر اکتفا نہیں بلکہ خود ذات پر سے بھی اعتماد اُٹھ جاتا ہے۔

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم رہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو وہ بھی کیا معلوم

پھر یہ بھی کہ

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

بقول شیکسپیئر زندگی دیوانے کی بڑ ہے جس میں شور وغل کے علاوہ کچھ نہیں۔

بیکٹ اپنے مشہور ڈرامے ''ویٹنگ فار گوڈو'' میں دکھایا ہے کہ زندگی دائروں میں گھومتی رہتی ہے۔ ایک ہی بات ہے جو بار بار ہوتی رہتی ہے۔ جیسا کہ لورکا نے Dona Rosita میں دکھایا ہے کہ بچے پیدا ہوتے ہیں پھر سکول جاتے ہیں بوڑھے ہوتے ہیں اور مَر جاتے ہیں اور یہ ہی عمل بار بار ہوتا رہتا ہے۔ جانے آنے کا یہ عمل مسلسل جاری رہتا ہے۔ دنیا میں کچھ بھی نیا نہیں ہے۔ بہت پہلے غالب نے کہا تھا:

ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں پابستگیٔ رسم و رہ عام بہت ہے

ایبسرڈسٹوں کا خیال ہے کہ ازل اور اَبد کچھ نہیں ہیں۔ زندگی صرف لمحۂ موجود میں ہے اور لمحے مسلسل نہیں ہیں نہ ہی اُن میں کوئی منطقی ربط ہے۔ زندگی محض ایک منظر ہے۔ ایک تماشہ ہے۔

بہے جاتے ہیں بے مقصود بحرِ زندگانی میں تماشہ ہے ہوا نے اک گرہ دیدی ہے پانی میں

اور ستم ظریفی یہ ہے کہ پانی کا بُلبُلا مصر ہے کہ اسے اشرف المخلوقات سمجھا جائے۔

زندگی میں جو منطق نظر آتی ہے وہ محض ایک فریب ہے۔ واقعات میں cause and effect کا کوئی رشتہ نہیں جبکہ ذہن اسی طریق پر کام کرتا ہے۔ خود ہمارا مذہب بھی ہمیں یہی بتاتا ہے کہ زندگی میں کچھ بھی قطعی نہیں ہے۔ اسی لیے ہر کام سے پہلے انشاء اللہ کہنا اور ہر وقت استغفار کرتے رہنا ضروری ہے۔ آدمی ہر وقت ہر بات کے لیے تیار رہے۔ انسان ارادے باندھتا ہے۔ خدا فیصلے کرتا ہے۔

بیکٹ کے ''ویٹنگ فار گوڈو'' کا موضوع انتظار ہے۔ سیدھا سادھا انتظار۔ کسی خاص بات یا کسی خاص چیز کا انتظار نہیں۔ ہر شخص رات کو اس اُمید کے ساتھ سوتا ہے کہ صبح کو کچھ نہ کچھ ہو جائے گا، لیکن اسے معلوم نہیں کہ کیا ہو جائے گا۔ انسان کے ساتھ سب سے بڑا مذاق یہ ہے کہ اس میں صلاحیتیں ہیں، لیکن اسے یہ معلوم نہیں کہ انہیں استعمال کیسے کیا جائے۔ وہ بول سکتا ہے مگر نہیں جانتا کہ کیا کہے۔ وہ سوچ سکتا ہے مگر اسے نہیں معلوم کیا کیا سوچے۔ اس میں کچھ کرنے کی صلاحیت ہے مگر وہ نہیں جانتا کہ کیا کرے۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ یہ مشورہ دیتا ہے:

> ''میں نے اپنی روح سے کہا قائم رہ اور کسی اُمید کے بغیر انتظار کر، اس لیے کہ اُمید غلط چیز کی اُمید ہوگی۔ محبت کے بغیر انتظار کر، اس لیے کہ محبت غلط چیز کی محبت ہو گی۔ پھر صرف ایمان رہ جاتا ہے، لیکن ایمان محبت اور اُمید۔ سب، انتظار میں ہیں۔ کسی خیال کے بغیر سوچ اس لیے کہ ابھی تو خیال کی اہل نہیں ہے۔''

چنانچہ انسان کو نہ خواہش کرنی چاہیے نہ اُمید رکھنی چاہیے۔ اس لیے کہ اسے نہیں معلوم کہ کیا خواہش کرے۔ کیا سوچ اور کیا اُمید رکھے۔ گوتم بُدھ نے اسی نظریے پر عمل کیا اور انہیں نروان مل گیا، لیکن ایک ہندی شاعر نے لکھا کہ یہ نظریہ صرف شہزادوں کو ہی زیب دیتا ہے۔ اگر وہ، یعنی شاعر، سب کچھ تج دینے کا فیصلہ کر لے اور برگد کے نیچے جا بیٹھے تو اس کے بچے یتیم خانے میں چلے جائیں گے اور بیوی چکلے میں۔ چنانچہ انسان تیاگ اور ذمہ داری کے تضاد میں پھنس جاتا ہے، لیکن سوال پھر بھی وہی ہے: ذمہ داری کیا ہے اور اس سے فرار کیا ہے؟

مذہب کے ذریعے یہ مسئلہ حل ہو سکتا تھا، لیکن مذہبوں میں اختلاف ہے۔ مابعد الطبیعاتی مسائل پر ایک رائے نہیں ہے۔ مذہبی عقائد ٹکراتے ہیں اور فرقہ واریت کو جنم دیتے ہیں جو آخر میں (Dogmatism) اندھی عقیدت یا لاادریت پیدا کرتے ہیں اور لاادریت تو خود لایعنیت ہے۔

اس سے ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے کہ ایبسرڈ ہی ایک معقول رویہ ہے اس لیے کہ یہ اس بات کا

اعتراف ہے کہ انسان کچھ نہیں جانتا۔ کچھ نہیں سمجھتا۔ علم صرف خدا کو ہے۔

پڑے بھٹکتے ہیں لاکھ پنڈت کروڑ دانا ہزار سیانے
جو خوب دیکھا تو یار آخر خدا کی باتیں خدا ہی جانے

لیکن ایبسرڈ کا تصور جو مغرب نے قائم کیا ہے، وہ منفی ہے اور ایک شکست خوردہ رویہ ہے۔ انکساری اور عاجزی کے بجائے، اپنی کم مائیگی کا اعتراف کرنے کے بجائے انسان نے سارے نظامِ حیات کو ہی بے معنی قرار دے دیا۔ ہم جانتے ہیں کہ علم کی حدود مسلسل بڑھ رہی ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ کسی وقت انسانی کی سمجھ میں کچھ آ جائے۔ زندگی بے مایہ نہیں ہے۔ انسان کی استعداد محدود ہے۔

☆☆☆

شفیق انجم

رشید امجد کی افسانہ نگاری

ساٹھ کی دہائی سے قبل کے اردو افسانوں کو اگر ہم روایتی کلاسیکی کہیں تو کچھ شبے کی بات نہیں کیونکہ یہ افسانے یلدرم اور پریم چند کی بنائی ہوئی لکیروں کے مطابق حرکت کرتے نظر آتے ہیں اور فنی و فکری ہر دو حوالوں سے تقریباً ایک سا چلن نظر آتا ہے۔ پلاٹ اور کردار افسانے کے لیے روح کا درجہ رکھتے تھے۔ سادہ بیانیہ انداز اور افسانے کی نشست و برخاست میں وحدتِ خیال اور وحدتِ تاثر کو ضروری خیال کیا جاتا تھا۔ افسانے میں ابتداء، وسط اور اختتام کا خاص دھیان رکھا جاتا تھا اور کہانی کسی نہ کسی واقعے کے گرد گھومتی تھی۔ اس افسانے میں موضوعاتی دائرہ خارجی حقائق کے گرد گھومتا ہے اور ارد گرد پھیلی دنیا کے مسائل کی خارجی سطحوں سے نقاب اٹھاتا ہے۔ محبت، عشق، ازدواجی زندگیاں، عورتوں کی مظلومیت و بے بسی، حسن، زندگی کی بے قدری، کسان، مزدور اور محنت کش طبقے کا استحصال، غربت کا گھن چکر، ملازم طبقے کے مسائل، معاشی الجھنیں، روٹی، کپڑے اور مکان کے حصول میں زندگی کی بے رحمی، امراء اور مراعات یافتہ طبقے کی نمود و نمائش اور مکروہ اعمال، طوائفوں کے طور طریقے اور بے چارگی، جہالت کی تباہ کاریاں برطانوی سامراج کے ظلم و ستم اور عوامی نفرت، قحط، بھوک اور افلاس سے سسکتے لوگ، بیماری اور لاچارگی کی اذیتیں، آزادی کے لیے جدوجہد، ہڑتالیں، جلسے جلوس اور اس صورت حال میں موجود معاشرتی اور معاشی مسائل کی تصویر کشی اس عہد کے افسانہ نگاروں کے محبوب موضوعات ہیں۔ ان موضوعات کو سیدھے سبھاؤ پیش کرنے میں یلدرم، پریم چند، نیاز فتح پوری، بیدی، کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی، غلام عباس اور منٹو کے نام نمایاں ہیں۔ درمیان میں اگرچہ 'انگارے' (جو سجاد ظہیر، احمد علی، رشید جہاں اور محمود الظفر کی کاوشوں کا نتیجہ تھا) ایک نیا انداز لے کر سامنے آیا لیکن ترقی پسند تحریک کی زبردست لہروں کے نیچے دب کر رہ گیا۔ یوں مجموعی طور پر اس عہد میں وہی رجحان ملتا ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے یعنی سماجی حقیقت نگاری، جنسی گھٹن، بے چارگی، استحصال، بغاوت، احتجاج اور انقلاب۔ ۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان بھی موضوعات میں کسی قدر تبدیلی کا باعث بنا اور فسادات اور ہجرت کے المیے پر بہت کچھ لکھا گیا لیکن افسانے کی بنت کاری، پیش کش اور اسلوب میں کچھ زیادہ تبدیلی واقع نہ ہوسکی۔

ساٹھ کی دہائی و مابعد کا افسانہ موضوعات اور تکنیک ہر دو حوالوں سے روایت شکن واقع ہوا۔ اس بنیاد پر اسے جدید افسانہ یا نیا افسانہ کہا گیا۔ ڈاکٹر رشید امجد کا تعلق افسانہ نگاری کے اسی عہد سے ہے۔ اس عہد میں افسانے کے موضوعات میں تیزی سے تبدیلیاں رونما ہوئیں اور ساتھ ہی فنی حوالوں سے برسوں ایک ہی ڈگر پر چلتے معیارات میں بھونچال سا آ گیا۔ پریم چند کی روایت میں لکھے گئے افسانوں،

جن میں زندگی کی حقیقتوں کی من وعن عکاسی ہوتی تھی، کی جگہ حقائق کو علامت واستعارے میں بیان کیا جانے لگا۔ گھستی ہوئی کہانی کی جگہ بے ربط پرچھائیوں نے لے لی۔ واقعے نے دھند کی دبیز چادر اوڑھ لی۔ کردار بے نشان ہو گئے۔ وحدتِ تاثر کی جگہ کثرت نے لے لی۔ کسی ایک نقطے کے گرد گھومنے کی بجائے بیک وقت مختلف نقطوں کے گرد رقص کا عمل شروع ہوا اور ساتھ ہی اسلوبیاتی سطح پر تجربوں کا ایک وسیع سلسلہ۔ شہزاد منظر جدید افسانے کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کلاسیکی افسانے میں پانچ بنیادی عناصر تسلیم کیے گئے ہیں: i ماجرا ii کردار نگاری iii مکالمہ نگاری iv مرکزی خیال اور زندگی کے بارے میں مصنف کا نقطۂ نظر یا تصورِ حیات۔ یہ کلاسیکی افسانے کی تعریف ہے۔ جدید افسانہ نگاروں نے سب سے پہلے ماجرے کو غیر ضروری قرار دے کر مسترد کر دیا، .....افسانے میں ماجرا اور کردار نگاری ختم ہو جانے کے بعد صرف مکالمہ نگاری مرکزی خیال اور مصنف کا تصورِ حیات رہ گیا۔ ظاہر ہے ماجرا اور کردار نگاری ختم ہونے کے بعد مکالمہ نگاری کی اہمیت خود بخود گھٹ گئی اور افسانے میں صرف مرکزی خیال اور تصورِ حیات رہ گیا''۔(۱)

یہ ایک بڑی فنی تبدیلی تھی جو ساٹھ کی دہائی میں اردو افسانے میں رونما ہوئی۔ اسی طرح کی بڑی تبدیلی موضوعاتی سطح پر بھی عمل میں آئی۔ بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ موضوعاتی سطح پر تبدیلی ہی نئے فنی تبدیلیوں کی راہ ہموار کی تو زیادہ درست ہوگا۔ خارجی حقائق نے یکا یک داخلی حقائق کا لبادہ اوڑھ لیا۔ اندر کے داغ باہر کے داغوں پر چھا گئے۔ علم نفسیات کی روز افزوں ترقی نے افسانہ نگار کو داخل کی پوشیدہ دنیاؤں سے متعارف کرایا۔ وجودیت نے تنہائی، کرب اور اجنبیت کے خوف کو مزید ابھارا۔ نئے سائنسی اور صنعتی نظام کی دھما چوکڑی کا عمل تیز تر ہونے کے سبب نفسانفسی اور افراتفری کے ساتھ شناخت کے مسئلے نے جنم لیا۔ نئے تجارتی عفریت کا کھلا منہ بھی موضوعات کا حصہ بنا اور بالخصوص پاکستان کی لڑکھڑاتی سیاسی، معاشی اور معاشرتی صورت حال کہ جس نے سب کو ہلا کر رکھ دیا اور اقدار کی شکست وریخت، خوابوں کے ٹوٹنے اور عدم اطمینان وعدم تحفظ جیسے موضوعات افسانہ نگاروں کا منہ چڑانے لگے۔ انہی کے پیشِ نظر اردو افسانے کے رخ میں تبدیلی آئی۔ نئے موضوعات اپنا اظہار نئے طریقے سے چاہتے تھے چنانچہ اظہار و بیان کے مروج سانچے توڑنے اور نئی سمت میں پیش قدمی کا سلسلہ شروع ہوا۔

رشید امجد کو اپنے فنی سفر کے آغاز پر ہی ایوب خان کے مارشل لاء سے واسطہ پڑا۔ اظہار و بیان پر پابندیاں عائد ہوئیں اور جبر وتشدد کا ایک خوفناک سلسلہ شروع ہوا۔ آگے چل کر جمہوری آزادیوں کی تحریک، یحییٰ خان کا مارشل لاء، سقوطِ ڈھاکہ، قومی اتحاد کی تحریکیں، جلاؤ گھیراؤ، بھٹو کی پھانسی اور ضیاء الحق کا مارشل لاء۔ کہ جس نے منافقت اور تشدد نے رہتے سہتے بندھن بھی توڑ دیئے۔ سیاسی خلفشار اور

منافقتوں کے اس جال میں سارا معاشرہ یوں زیر دام آیا کہ اقدار و اخلاقیات، بھائی چارے، محبت، مروت اور اعتماد کی دھجیاں بکھر گئیں۔ خواب اجڑے، تنہائی، مایوسی اور افسردگی نے چادر پھیلائی اور سب کو اپنی اذیت ناک آغوش میں لے لیا۔ رشید امجد جیسے حساس شخص کے لیے یہ بے بسی، محرومی، نارسائی، بے چہرگی اور بنجر پن ایک مسلسل افسوس، ایک مسلسل روگ اور ایک مسلسل کرب بن گیا۔ بیزار آدم کے بیٹے، کے دیباچے میں وہ لکھتے ہیں:

''اس بے شباہت دور کی منافقت نے چیزوں کو اس طرح بے توقیر کر دیا کہ تنہائی، جس کی کوکھ سے کبھی کشف، گیان اور عظمت کے چشمے پھوٹتے تھے اب ہولناک سناٹے کا روپ دھار چکی ہے۔ اس تنہائی میں سے ایک کربناک مسخ چہرے والی بے خواب ویرانی نے جنم لیا ہے جس کا تصور آتے ہی بانجھ پن آنکھوں میں ناچنے لگتا ہے اور اذیت جسموں پر دستک دینے لگتی ہے۔ اب گیان اور کشف کہاں کہ لفظوں کے کشکول مدتوں سے خالی ہیں۔ لفظ دم توڑ رہے ہیں''۔(۲)

رشید امجد کے ہاں بنیادی موضوع یہی کربناک مسخ چہرے والی بے خواب ویرانی ہے۔ یہ ویرانی باہر سے بھی اور خود رشید امجد کے اندر سے بھی ابھرتی ہے۔ اپنے خوابوں کی سرزمین (کشمیر) سے اپنی مرضی کے بغیر نکل آنا، پھولوں بھرے گلی کوچوں سے نکل کر دھول اڑاتے بنجر ویرانوں میں آ بسنا اور جنسی، معاشی، معاشرتی بکھیڑوں کی بھینٹ چڑھ جانا اس کے لیے کسی سانحے سے کم نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر وہ اپنی کہانی اپنی ذات سے شروع کرتا ہے۔ الجھتا ہے تو ارد گرد پناہ کی تلاش شروع کر دیتا ہے اور تلاش کرتے کرتے خود کو بھی گم کر بیٹھتا ہے۔ ارد گرد سبھی موجود ہیں لیکن سبھی گم۔ سبھی کسی کو تلاش کرتے پھر رہے ہیں لیکن اپنے آپ کو کھو بیٹھے ہیں:

''میں وہ اور دوسرے سب دن کے روشن بازاروں اور رات کی کالی کملیوں میں اسے تلاش کرتے کرتے اپنے آپ کو بھی کھو بیٹھے ہیں اور اب ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں۔

میں کون ہوں؟

تم کون ہو؟

وہ کون ہے؟

وہ جو خوشبو کی طرح محسوس تو ہوتی ہے، دکھائی نہیں دیتی (لیکن خوشبو تو صرف ان کے لیے ہے جو سونگھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں)''۔

(خواب آئینے)

اس گمشدگی کے عالم میں اسے اپنے اندر اور باہر کی ویرانی گھیر لیتی ہے اور سناٹا بولنے لگتا

ہے۔ایسا سناٹا کہ جو اعصاب کو شل کیے جا رہا ہے دل و دماغ سن ہو رہے ہیں۔وہ بولنا چاہتا ہے اور بولتا بھی ہے لیکن آواز سنائی نہیں دیتی۔وہ سوچنا چاہتا ہے اور سوچتا بھی ہے لیکن سمجھ نہیں پاتا کہ کیا سوچتا ہے۔اپنے آپ کو چھونا چاہتا ہے لیکن وجود نہ جانے کہاں گم ہو گیا ہے۔دیکھنا چاہتا ہے لیکن ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا:

''میں چیخنا چاہتا ہوں۔مگر میری آواز اندھیرا ہے
میں بولنا چاہتا ہوں مگر میرے الفاظ اندھیرا ہیں
میں سوچتا ہوں۔میں ہوں
اس سے آگے اندھیرا گاڑھا اندھیرا
میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سامنے والی دیوار پر بیٹھے ہوئے
اس کو دیکھنا چاہتا ہوں مگر چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا
اندھیرا ہی اندھیرا
لفظ گم، آواز گم، وجود گم''۔

(پت جھڑ میں خود کلامی)

اس اندھیرے میں، گمشدگی کے عالم میں، تنہائی کا احساس اور بھی گہرا ہو جاتا ہے۔ایسی تنہائی جو خوف کا چابک لیے ہر لمحہ پل پڑنے کو تیار کھڑی ہے۔خوف، انجانا خوف۔کہ جس سے بچ نکلنے کی کوئی صورت نہیں۔کوئی راستہ نہیں، کوئی مددگار نہیں، مددگار خود مدد کے طالب ہیں کہ انہیں بھی یہی صورت درپیش ہے۔عجب بے بسی ہے کہ شہر کا شہر جکڑا پڑا ہے۔بے بسی کے جبڑوں میں دبا پڑا ہے:

''آسمان کا طشت اندھیرے سے لبالب بھرا ہوا ہے اور الف ننگی رات ہاتھوں
میں خوف کے چابک لیے گلیوں اور سڑکوں پر ناچ رہی ہے.....خاردار
باڑوں اور بے بسی کے جبڑوں میں دبا ہوا شہر''۔

(بانجھ ریت اور شام)

یہ خوف، تنہائی، اجنبیت، اندھیرا، ویرانی، جبر اور ہونے یا نہ ہونے کا کرب ناک احساس سب وجودی عناصر ہیں اور ساٹھ کی دہائی کے دیگر افسانہ نگاروں کے ہاں بھی تسلسل سے ملتے ہیں۔بالخصوص انور سجاد نے وجودیت سے گہرے اثرات لیے اور انہیں اردو افسانے کا موضوع بنایا لیکن رشید امجد کے ہاں یہ عناصر باہر سے درآمد کردہ اور محض فیشن کے طور پر یا اپنی انفرادیت کے لیے نہیں، بلکہ یہ اس کی ذات کی بھٹی کے انگارے ہیں۔اس بھٹی میں وہ خود مدتوں سلگتا رہا۔اپنے خارج اور باطن سے سمیٹی ہوئی یہ آگ اس کی اپنی ہے، اس کی ذات کا حصہ ہے؛ اسی لیے تپش میں بلا کی گرمی ہے۔پروفیسر احمد جاوید اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

''جب ساٹھ کی دہائی میں نئے افسانے کی روایت آغاز ہوئی تو نئے افسانے کو

بیان کرنے کے لیے بیشتر افسانہ نگاروں نے فلسفۂ وجودیت میں پناہ لی اس ضمن میں سارتر اور کامیو کا حوالہ اکثر سننے میں آتا تھا۔گویا ایک سطح پر یہ انٹلکچوئل کام بھی تھا مگر رشید امجد کے ہاں یہ حقیقت اور طرح سے مطالعہ کرنے کے قابل ہے۔اس کے ہاں وجودی مسائل خود اپنی ذات پر جھیلے گئے تشدد سے پیدا ہوتے ہیں۔محض انٹلکچوئل پناہ گاہ بن کر نہیں آئے۔معاصر افسانہ نگاروں میں انور سجاد کا تذکرہ یہاں کیا جا سکتا ہے جس نے سیاسی جبر سے وجودیت کی راہ نکالنے کی کوشش کی مگر رشید امجد کے ہاں سیاسی جبر ہی واحد حقیقت نہیں بلکہ یہ حقیقت بھی ان حقائق کا حصہ ہے جو سماجی نظام اور فطرت کا جبر از خود پیدا کرتے رہتے ہیں۔اس طریقے سے میں کون ہوں؟ اور میں کہاں ہوں؟ یہ بنیادی سوالات اس کے اپنے تجربات سے کشید کیے ہوئے سوالات بنتے ہیں''۔(۳)

رشید امجد کے ہاں جبر کے کئی مفاہیم ہیں، بہت سی تہیں ہیں_____ یہ جبر روزمرہ زندگی کی معمولی سے معمولی خواہشوں، آرزؤں اور تمناؤں کے مقتل سے ہوتا، سیاسی، معاشی، معاشرتی، مذہبی، ذہنی، نفسیاتی اور جنسی دنیاؤں کے گرد گھیرا ڈالے کھڑا ہے۔اس گھیرے کے ساتھ ایک اور گھیرا وقت کا اور اس کے اوپر تقدیر اور نہ جانے کتنے ہی گھیرے ہیں کہ جن کے درمیان انسان پڑا سسک رہا ہے۔لاچار و بے بس، ازل سے ایک ہی دائرے میں کولہو کے بیل کی طرح گھومتا ہوا۔ایک ایسا نوحہ کہ جس کا نہ کوئی عنوان ہے نہ موضوع:

''میں، وہ اور دوسرے سب تصویر کی نا تکمیلی کا نوحہ ہیں۔ایسا نوحہ کہ جس کا نہ
کوئی عنوان ہے، نہ موضوع۔پہلی سطر سے ماتم شروع ہوتا ہے اور آخری سطر،
لیکن آخری سطر تو ابھی لکھی ہی نہیں گئی۔اس آخری سطر کو لکھنے کے لیے میں، وہ
اور دوسرے سب کبھی دن کے روشن کاغذ پر لکیریں کھینچتے ہیں اور کبھی رات کے
سیاہ بدن پر نقطے بناتے ہیں''۔

(خواب آئینے)

رشید امجد نے جبر کی اس فضا کو جو اس نے اپنے عہد میں پوری شدت کے ساتھ رونما ہوتے دیکھی_____ اپنے افسانوں میں من و عن سمو دیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس ذہن کو بھی جو اس فضا میں پرورش پا رہا تھا۔ایک خلجان زدہ ہونق اور سہما ہوا ذہن، کہ جس میں سوائے خوف اور بے چینی کے کچھ ابھرتا ہی نہیں اور جو شکوک و شبہات، بے اعتباری، تذبذب اور گھٹن کا شکار ہو؛ امید، روشنی اور خوشی جیسے لفظوں سے نا آشنا ہو چکا ہے۔

''ساری ہی راتیں تاریک اور ڈراؤنی ہوتی ہیں لیکن وہ رات اتنی گھنی، سیاہ اور

ڈراؤنی تھی کہ اسے اپنے آپ سے بھی ڈر لگ رہا تھا اس نے اپنے آپ کو سمیٹ کر ایک کونے میں ڈھیر کر لیا تھا۔ اس نے سوچا! کاش یہ گھنی سیاہ ڈراؤنی رات اتنی پھیل جائے کہ وہ کبھی اپنے چہرے کو نہ دیکھ سکے''۔

(بے پانی کی بارش)

ماحول اور زندگی کا جبر اور اس سے متعلق عناصر، رشید امجد کے ہم عصروں کے ہاں بھی موضوع بنتے ہیں۔ انتظار حسین، انور سجاد، احمد داؤد، احمد جاوید اور اعجاز راہی نے اپنے اپنے انداز میں انھیں اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔ اس سلسلے میں بطورِ خاص انتظار حسین کے افسانوں ''خواب اور تقدیر'' اور ''ذات'' کا حوالہ دیا جا سکتا ہے۔ احمد جاوید کے افسانے ''جلتی بجھتی رات''، ''گمشدہ شہر کی داستان'' اور انور سجاد کے افسانے ''نہ مرنے والا'' اور ''پتھر لہو کتا''۔ لیکن انتظار حسین اور انور سجاد کے ہاں یہ موضوع بطور موضوع برتنے کا عمل صاف نظر آتا ہے۔ خود دیکھنے، محسوس کرنے، جذب کرنے اور اپنے اندر کی آنچ پر تپا کر اس صورت حاصل کو بیان کرنے کے عمل میں رشید امجد اور احمد جاوید شانہ بشانہ کھڑے ہیں۔ ان کے یہاں لہجے کی المناکی اور بیان کی شدت خود بولتی ہے کہ جو کہا جا رہا ہے وہ خالص ذاتی تجربہ ہے اور جس کے شعلے باہر سے اندر اور اندر سے باہر لپکتے محسوس ہوتے ہیں۔ ممتاز مفتی نے رشید امجد کے بارے میں ایک جگہ لکھا ہے:

> ''وہ لاشعور کے زور پر افسانہ لکھتا ہے۔ شعور کے زور پر افسانہ لکھو تو پہلے مرکزی خیال کا انڈا تلاش کرنا پڑتا ہے۔ پھر اس انڈے پر بیٹھ کر اسے سینچنا پڑتا ہے۔ رشید امجد شعوری تگ و دو سے بے نیاز ہے۔ جبھی اس کے افسانوں میں زندگی کی پُراسراریت کا عنصر موجود ہے۔ یہ کیوں ہوا؟ کیسے ہوا؟.....لکیریں چل رہیں ہیں''۔ (۴)

ادھر ہی ایک مسئلہ شناخت سے متعلق ہے یہ بھی رشید امجد کے مرکزی موضوعات کے دائرے میں آتا ہے۔ شناخت کا مسئلہ اسی وقت جنم لیتا ہے جب وجود کی اکائی بکھر جائے، شخصیت ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے اور جسم و ذہن کی درمیانی کڑیاں ٹوٹنے لگیں۔ رشید امجد کے ہاں کڑیاں ٹوٹنے، ریزہ ریزہ ہو جانے، ٹکڑوں میں بٹ جانے اور یوں بے چہرہ اور ناقابل شناخت ہو جانے کا مسئلہ بار بار سر اٹھاتا ہے۔ اسے اپنے اردگرد ہر چیز بٹی ہوئی اور بے چہرہ نظر آتی ہے۔ ریزہ ریزہ چہرے، ریزہ ریزہ جسم اور ریزہ ریزہ ذہن ___ کہ جنھیں کچھ معلوم نہیں کہ ان کی اصل کیا ہے۔ نہ اپنی کوئی سوچ، نہ ارادہ، نہ نظریہ۔ بس ریزہ ریزہ ہوا کے دوش پر اڑتے پھرتے ہیں۔ قیام پاکستان کی ہولناک فضا، بعد کی بے چینی اور معاشی، سیاسی اور معاشرتی سطح پر تعفن زدہ ماحول اور بالخصوص مشرقی پاکستان کے ٹوٹنے کا عمل، شناخت کے مسئلے کو بڑھاوا دیتا ہے۔ خواب ٹوٹے، سپنے شکست ہوئے اور قہر و جبر کی آندھیوں نے یوں پیسا کہ شخصیتیں پارہ پارہ ہو

گئیں۔ وہ سفر کہ جو ایک نقطے پر نظریں جما کے سب نے ایک ساتھ شروع کیا تھا ادھورا رہ گیا۔ نقطہ بھی غائب ہو گیا، رستے بھی معدوم ہو گئے، قافلہ بھی بکھر گیا ___ اب کیا کریں؟ کسی کو نہیں معلوم۔ اب کیا ہوگا؟ ___ نہیں معلوم۔ کہاں ہیں، کیوں ہیں، کدھر جائیں۔ نہیں معلوم۔ رشید امجد بھی اسی قافلے میں موجود ہے، سب کچھ دیکھ رہا ہے، محسوس کر رہا ہے اور اس انتشار، بکھراؤ، عدم شناخت، عدم تشخص اور عدم تحفظ کے ماحول کی حقیقی تصویریں کھینچ رہا ہے۔ اپنی بھی اور اوروں کی بھی۔

''اب معلوم نہیں، یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ ہم گٹر میں ہیں یا شہر میں، شہر میں ہیں یا گٹر میں''۔

(سناٹا بولتا ہے)

رشید امجد نے شناخت اور عدم شناخت کے مسئلے کو نہ صرف اپنی ذات، فضا اور ماحول کے اندر رہ کر دیکھا دکھایا بلکہ اسے مجموعی انسانی اور کائناتی تسلسل میں بھی سمجھنے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر نوازش علی لکھتے ہیں:

> ''عدم شناخت، بے چہرگی، گمشدگی، بٹی ہوئی شخصیت، عدم وجود، ہجوم میں شناخت، ذاتی عدم شناخت سے لے کر معاشرتی عدم شناخت، پورے انسانی نظام میں ایک فرد کی شناخت، پھر کائنات میں اپنی شناخت اور کائنات میں فرد کا مقام ___ یہ تمام مسائل اس کے افسانوں میں بار بار سر اٹھاتے ہیں۔ شناخت اور تشخص کا عمل، فرد سے شروع ہو کر اجتماع اور اجتماع سے پھر فرد اور فرد کے حوالے سے کائناتی ہو جاتا ہے''۔ (۵)

رشید امجد اپنے عہد کا ناظر بھی ہے اور ناقد بھی۔ اس نے اپنے عہد کے انفرادی و اجتماعی مسائل کو نہ صرف اپنا موضوع بنایا ہے بلکہ نتائج بھی اخذ کیے ہیں۔ اس عہد کے بہت سے افسانہ نگار حال کے نقطے پر جم کے رہ گئے، کچھ نے ماضی کی طرف ہاتھ بڑھایا اور کچھ نے مستقبل سے گلے ملنے کی کوشش کی۔ رشید امجد ایسا افسانہ نگار ہے جو حال کے سینۂ ستواں پر کھڑا اردگرد کا بغور جائزہ بھی لے رہا، چیزوں کو جانچ پرکھ بھی رہا ہے اور یہیں سے ماضی و مستقبل کو بھی اپنے آپ میں سمو رہا ہے اپنی اس خصوصیت کی بنا پر اس کے افسانے فکری سطح پر دوسروں سے ممتاز نظر آتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر وزیر آغا:

> ''انتظار حسین نے پیچھے ہٹ کر کتھا اور داستان سے رشتہ جوڑا اور انور سجاد نے آگے بڑھ کر مستقبل کو زیرِ دام لانے کی کوشش کی، جبکہ رشید امجد نے حال کے نقطے پر کھڑے ہو کر ماضی اور مستقبل دونوں سے رابطہ قائم کیا.....یہی اس افسانہ نگار کے فن کا امتیازی وصف ہے کہ وہ زنجیر کے کسی ایک سرے سے بندھا ہوا نہیں ہے بلکہ پوری زنجیر سے جڑا ہوا دکھائی دیتا ہے''۔ (۶)

پوری زنجیر سے جڑنے کا یہ عمل رشید امجد کے افسانوں میں رنگارنگی لے کر آتا ہے ایسی رنگارنگی

جوفکری سطح پر شاید ہی اس عہد کے کسی دوسرے افسانہ نگار کے ہاں ملے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بیک وقت جدید بھی ہے اور قدیم بھی۔ سماجی حقیقت نگاری سے علامت و تجرید، جنس، محبت، سیاست، تصوف، اخلاقیات، فلسفہ، مذہب غرض زندگی کے ہر شعبے سے وہ یوں جڑا ہوا ہے کہ لکھتے ہوئے اسے کسی الجھن کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ شاید اسی وجہ سے ممتاز مفتی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ رشید امجد بھی کیسا افسانہ نویس ہے۔ نہ سوچتا ہے، نہ اسے ذہنی طور پر بناتا ہے، نہ کڑیاں جوڑنے کے لیے تگ و دو کرتا ہے۔ دوستوں کے ساتھ گپ بازی بھی کرتا ہے، ساتھ افسانہ بھی لکھتا جاتا ہے۔

رشید امجد کے عہد کے فکری تنوع نے افسانے کے سیدھے سادھے بیانیہ انداز کو یکسر بدل دیا اور اس کی جگہ علامت، تجرید اور تمثیلی انداز نے لے لی۔ افسانے میں اس روش کی بنیاد ۱۹۵۸ء کے مارشل لاء کو قرار دیا جاتا ہے لیکن یہ محض ایک وجہ ہے۔ ترقی پسند تحریک پر پابندی، مغربی ادبی تحریکوں کے اثرات اور نیا صنعتی، تجارتی اور سائنسی منظر نامہ بھی اس تبدیلی کی بنیاد بنتے ہیں۔ علامتی افسانہ آغاز ہوا تو مثبت اور منفی ہر دو سطحوں پر اس سے کام لیا گیا۔ بہت سے افسانہ نگاروں نے محض فیشن کے طور پر نا قابل فہم علامتوں کا اندھا دھند استعمال کیا اور یوں افسانے کا ابلاغ مشکل بلکہ ناممکن ہو گیا۔ لیکن چند ایک افسانہ نگاروں نے اس سے تعمیری سطح پر استفادہ کیا اور علامتوں کو فنی مہارت کے ساتھ پیش کر کے نئے مفاہیم پیدا کیے۔ نئی علامتیں بھی بنائیں اور پرانی علامتوں کو نیا پیکر بھی بخشا۔ اور ان سے ذرا آگے تجرید اور تمثیل کو بھی اظہار کا ذریعہ بنایا۔ آزاد تلازمۂ خیال کے ذریعے کہانی کی مروج بنت کو توڑ کر اسے ایک نئی شکل دی گئی اور خیال کی تجسیم کے تجربے بھی کیے گئے۔ یہی وجہ ہے اس دور کے افسانے میں ایک نیا طرز اظہار اور اسلوبیاتی رنگ روپ نظر آتا ہے۔ رشید امجد کا تعلق اسی گروہِ ثانی سے ہے جو نئی تکنیک اور اظہار و بیان کے نئے پیرائے تو استعمال کرتے ہیں لیکن افسانے کو اس کے افسانوی معیار سے گراتے نہیں۔ اگرچہ اس میں بھی بہتر، بہت بہتر اور بہترین کی تدریج موجود ہے۔

افسانے نے خارج سے داخل کی طرف رخ موڑا تو ظاہر ہے احساسات کی دنیا ایک نئے اظہار کی متقاضی تھی اور اس کے لیے سیدھے سادے انداز پر عمل پیرا نہیں ہوا جا سکتا تھا نتیجتاً شاعرانہ وسائل سے کام لینے کا عمل شروع ہوا تا کہ ایسی زبان کا سہارا مل سکے جو ہر طرح کے امیجز قبول کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ رشید امجد کے ہاں یہ شاعرانہ فضا بنانے کا عمل اس عہد میں سب سے نمایاں ہے۔ ان کے ہاں یہ عمل دوسروں کی نسبت زیادہ بہتر انداز میں اس لیے ملتا ہے کہ وہ شاعری سے فطری شغف رکھتے ہیں۔ ان کی نثر میں شعریت بالکل فطری معلوم ہوتی ہے اور وہ تہہ دار شعور کو گرفت میں لانے کے لیے بھول بھلیوں کا شکار نہیں ہوتے۔ ڈاکٹر نوازش علی کے مطابق:

> ''شاعرانہ وسائل اس کے تہہ دار شعور کے ابلاغ کے لیے اس کی معاونت کرتے ہیں۔ یہاں شاعرانہ لب و لہجہ اور شاعرانہ وسائل مقصود بالذات نہیں ہیں بلکہ

> اس کے تخلیقی شعور پر جھلملانے والے مختلف النوع احساسات کو بیک وقت گرفت میں لینے کی کوشش کے نتیجہ میں خود بخود جزوِ تحریر بن گئے ہیں''۔ (۷)

اگرچہ باطن کے اظہار کے لیے شاعرانہ فضا بنانے کا عمل رشید امجد کے ہم عصروں انتظار حسین، سریندر پرکاش، بلراج مینرا، خالدہ حسین اور انور سجاد کے ہاں بھی ملتا ہے اور وہ اپنے اپنے انداز میں اس کا حق بھی ادا کرتے ہیں لیکن بقول احمد جاوید: نئے افسانے میں شاعری اور بالخصوص نظم سے جو حقیقی قرابت رشید امجد کے ہاں دکھائی دیتی ہے وہ بادی النظر میں دوسروں کے ہاں اس طرح موجود نہیں، اور ڈاکٹر بشیر سیفی کے نزدیک: رشید امجد کی سب سے بڑی پہچان اس کا شعری اسلوب ہے جو اردو کے جدید افسانہ نگاروں میں سے شاید ہی کسی اور کو نصیب ہوا ہے۔ اسلوب میں شعریت کے ساتھ جب وہ تجسیم کا دیا بھی روشن کر دیتے ہیں تو لطف دیدنی ہوتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

> ''اندھیرا اوباش لڑکوں کی طرح سیٹیاں بجاتا شرماتی شام کے پیچھے لگا ہوا ہے۔ شام چھجوں، سائبانوں اور کرنوں میں سمٹ رہی ہے''۔
>
> (دھوپ میں سیاہ لکیر)

> ''اندھیرا آنکھیں ملتا ہوا رات کے بستر سے کہنیوں کے بل اٹھ رہا ہے اور کجلایا ہوا سویرا کسی سمٹی سمٹائی دلہن کی طرح ملگجی گھونگھٹ نکالے دبے پاؤں سیڑھیاں اتر رہا ہے''۔
>
> (یا ہو کی نئی تعبیر)

> ''ہندسہ اس کے ہاتھوں میں آتے ہی چُرمُر ہو گیا''۔
>
> (ریت پر گرفت)

> ''بھاری غرارے والی خاموشی ریکارڈنگ روم میں ٹہل رہی ہے''۔
>
> (چپ فضا میں تیز خوشبو)

رشید امجد کے باطن میں پھیلی ہوئی رنگا رنگی، تازگی اور خلاقیت کی خوشبو ہر قسم کے موضوع کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ موضوع چاہے خیال سے واقعے کی طرف بڑھے یا کسی واقعے سے خیال کی طرف ___ یہ خوشبو اس کے گرد ہالہ سا بنا لیتی ہے اور پھر شاعر رشید امجد کا عمل شروع ہو جاتا ہے جس کے زیرِ نگیں آتے ہی کہانی خود بخود اپنی علامتیں وضع کرنے لگتی ہے، تلازمات بننے لگتے ہیں، تشبیہیں اور استعارے اُمڈ آتے ہیں ___ کہانی کی بنت شروع ہو جاتی ہے۔ اپنی مرضی سے حرکت کرتی لکیریں دیکھتے ہی دیکھتے ایک اکائی کی صورت اختیار کر لیتی ہیں اور ایک ملائم، شعریت سے پُر، فکر کی تازگی اور خلاقیت کی خوشبو سے مہکتی کہانی عدم سے وجود میں آ جاتی ہے۔ شہزاد منظر لکھتے ہیں:

> ''رشید امجد نوجوان افسانہ نگاروں میں واحد افسانہ نگار ہے جس نے اپنے

افسانوں میں نہایت کامیابی کے ساتھ زبان و بیان کے تجربات کیے ہیں۔
نہایت خوبصورتی سے امیجز استعمال کیے ہیں اور اس طرح جدید افسانے کو نثری
شاعری سے قریب لانے کی شعوری کوشش کی۔ رشید امجد نے افسانے کے لیے
نہ صرف مروجہ اسلوب سے انحراف کیا بلکہ اظہار کے لیے لسانی تشکیلات سے
بھی کام لیا اور اظہار کو ایک نیا روپ بخشنے کی کوشش کی''۔(۸)

بحث کو سمیٹتے ہوئے یہ کہنا یقیناً درست ہے کہ رشید امجد اپنے عہد کا سب سے نمایاں اور ممتاز افسانہ نگار ہے۔ وہ ایک مسکراتا ہوا فلسفی، ایک بے قاعدہ شاعر اور باقاعدہ افسانہ نگار ہے۔ اس میں صورت حال کو دیکھنے، محسوس کرنے اور بیان کرنے کا فن دوسروں کی نسبت کہیں زیادہ اور حقائق کی بازیافت کا عمل تیز تر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کل بھی معتبر تھا اور آج بھی معتبر ہے۔

حواشی

1 شہزاد منظر، علامتی افسانے کے ابلاغ کا مسئلہ، منظر پبلیکیشنز ۱۹۹۰ء، ص ۵۲
2 رشید امجد، ڈاکٹر، بیزار آدم کے بیٹے، دستاویز پبلشرز، راولپنڈی ۱۹۷۴ء
3 احمد جاوید، پروفیسر، ''رشید امجد کا فنی سفر''، مشمولہ 'روشنائی'، کراچی، شمارہ ستمبر تا جولائی ۲۰۰۳ء ص ۲۳۱
4 ممتاز مفتی، مجاہد ہاتھ، مشمولہ روشنائی، ایضاً ص ۲۱۲
5 نوازش علی، ڈاکٹر، ''اُردو افسانہ نگاروں کے اسالیب''، مشمولہ دریافت 1، اسلام آباد، شمارہ جون ۲۰۰۲ء، ۲۲۳
6 وزیر آغا، ڈاکٹر، ''رشید امجد کے افسانے''، مشمولہ روشنائی، کراچی، ص ۲۰۶
7 نوازش علی، ڈاکٹر، ''رشید امجد کا اسلوب''، مشمولہ روشنائی، کراچی، ۲۲۶
8 شہزاد منظر، اقتباس، مشمولہ روشنائی، کراچی، ص ۲۲۴

کتابیات

1 انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، انجمن ترقی اردو، بار چہارم، ۱۹۹۹ء
2 بشیر سیفی، ڈاکٹر، تنقیدی مطالعے، نذیر سنز پبلشرز لاہور، ۱۹۸۶ء
3 جمیل ملک، ادبی منظر نامے، مقبول اکیڈمی لاہور، ۱۹۹۶ء

4 رشید امجد، ڈاکٹر، دشتِ نظر سے آگے (کلیات)، مقبول اکیڈمی لاہور، ۱۹۹۲ء
5 عکسِ بے خیال، دستاویز مطبوعات، لاہور، ۲۰۰۳ء
6 ست رنگے پرندے کے تعاقب میں، حرف اکیڈمی، راولپنڈی، ۲۰۰۲ء
7 فردوس انور قاضی، ڈاکٹر، اردو افسانہ نگاری کے رجحانات، مکتبہ عالیہ لاہور، ۱۹۹۰ء
8 نوازش علی، ڈاکٹر، مرتب: عبارت 1۔ پاکستان میں اردو ادب کے پچاس سال، دھنک پرنٹرز راولپنڈی، ۱۹۹۷ء

رسائل

1 الفاظ: (دوماہی)، شمارہ جنوری، فروری، مارچ، اپریل، ۱۹۸۸ء، علی گڑھ
2 دریافت: (سالنامہ) شمارہ جون ۲۰۰۲ء، اسلام آباد
3 روشنائی: (سہ ماہی) شمارہ جولائی تا ستمبر ۲۰۰۲ء، کراچی

لوہسون/ڈاکٹر شاہ محمد مری

آہ کیو کی سچی کہانی

لوہسون کا یہ شاہکار افسانہ چینی ادب میں عظیم ترین تحریروں میں شمار ہوتا ہے۔
یہ افسانہ چین میں بدترین جاگیرداری نظام کے پس منظر میں برپا شدہ 1911
کے بورژوا انقلاب کی زبردست تصویر کشی کرتا ہے۔

باب اول
تعارف

کئی برس سے میرا ارادہ تھا کہ آہ کیو کی سچی کہانی لکھوں۔لیکن اس خواہش کے ساتھ ساتھ ایک گھبراہٹ سی بھی تھی جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جنہیں لکھنے سے شہرت نصیب ہوسکتی ہو۔اسلیے کہ کسی لافانی انسان کے کارنامے ریکارڈ کرنے کیلئے ایک لافانی قلم کی ضرورت ہوتی ہے۔ایک ایسے شخص کی ضرورت ہوتی ہے جو کہ تحریر کے ذریعے اگلی نسلوں تک جانا جائے۔ایک ایسی تحریر جو اس شخص کے ذریعے اگلی نسلوں تک جانی جائے۔۔۔۔جب تک یہ واضح نہ ہوجائے کہ کون کس کی شناخت کروارہا ہے۔لیکن ہر بار جیسے کسی بھوت پریت نے مجھے قابو کرلیا ہو، اور میں آہ کیو کی کہانی لکھنے کے ارادے سے باز آتا گیا۔

اور جونہی میں نے قلم اٹھایا مجھے اندازہ ہوا کہ ایک بے مثال تصنیف میں تو انتہائی مشکلات حائل ہوتی ہیں۔پہلی مشکل یہ تھی کہ اسے کیا نام دیا جائے۔''اگر نام درست نہ ہو تو الفاظ سے سچ کی گونج نہ آئے گی''۔۔۔۔اس ضرب المثل کا حد سے زیادہ خیال رکھنا پڑے گا۔سوانح عمریوں کی تو کئی قسمیں ہوتی ہیں: آفیشل سوانح عمری، خودنوشت سوانح عمری، بلا اجازت سوانح عمری، آباوجداد کی سنائی ہوئی کہانی، اضافہ کی گئی سوانح عمری، خاندانی تواریخ، خاکے ..... مگر بدقسمتی سے ان میں سے کوئی بھی میرے مقصد کیلئے موزوں نہ تھی۔''آفیشل سوانح عمری؟''لیکن اس صنف کو بہت ہی ممتاز شخصیات کی سوانح عمریوں کی کسی باوثوق تاریخ میں شامل نہیں کیا جاسکتا۔''خودنوشت سوانح عمری؟''لیکن ظاہر ہے کہ میں آہ کیو نہیں ہوں۔اگر میں اسے ''بلا اجازت سوانح عمری'' کہوں تو پھر اس کی ''اجازت والی سوانح عمری'' کہاں ہے؟۔''لیجنڈ والی کہانی'' کا استعمال ناممکن ہے اسلیے کہ آہ کیو کوئی لیجنڈری شخصیت ہے نہیں۔''اضافہ کی گئی سوانح عمری؟''لیکن کسی صدر نے قومی تاریخ کے انسٹی ٹیوٹ کو آہ کیو کی ایک ''معیاری سوانح عمری'' لکھنے کا حکم کبھی دیا ہی نہیں۔گو کہ مستند انگریز تاریخ میں ''جواریوں کی زندگیاں'' نہیں ہیں

لیکن مشہور مصنف کینن ڈوئل نے روڈنی سٹون لکھا۔لیکن ایسا تو کوئی بہت ہی مشہور مصنف کرسکتا ہے، میرا جیسا نہیں۔اب رہ جاتی ہے ''خاندانی تاریخ''۔لیکن مجھے معلوم نہیں ہے کہ آیا میں اسی خاندان سے تعلق رکھتا ہوں جس سے آہ کیو کا تعلق تھا۔اور نہ ہی مجھے اسکے بچوں پوتوں نے ایسا کوئی فریضہ سونپا ہے۔ اگر مجھے ''خاکہ'' لکھنا ہوتا تو یہ اعتراض کیا جاسکتا تھا کہ آہ کیو کی کوئی ''مکمل سرگزشت'' ہے ہی نہیں۔ المختصر، یہ واقعی ایک ''سوانح عمری'' ہے۔میں یہ آخری دو الفاظ اپنے عنوان کے طور پر اٹھالیتا ہوں۔اور اگر یہ قدما کی ''خطاطی کی سچی کہانی'' سے ملتا جلتا عنوان لگے تو ہم کچھ نہیں کرسکتے۔

دوسری مشکل یہ تھی کہ اس طرح کی ایک سوانح عمری ایسے الفاظ سے شروع ہونی چاہیے: ''فلاں جس کا اصل نام فلاں تھا، فلاں جگہ کا رہنے والا تھا''۔مگر سچی بات یہ ہے کہ مجھے معلوم نہیں ہے کہ آہ کیو کا خاندانی نام کیا تھا۔لگتا ہے کہ ایک زمانے میں یہ ''چاؤ'' تھا مگر پچھلے دنوں اس معاملے پر پھر ایک تنازعہ کھڑا ہوگیا۔یہ جھگڑا اس وقت ہوا جب مسٹر چاؤ کے بیٹے نے کاؤنٹی کا امتحان پاس کیا اور گاؤں میں اس کامیابی کی منادی کرائی گئی۔آہ کیو، جس نے ابھی ابھی زرد شراب کے دو کٹورے چڑھائے تھے، اس اعلان کے متعلق شوخی مارنی شروع کردی کہ یہ اعزاز اُس کا بھی ہے۔اسلیے کہ وہ بھی اسی قبیلے سے تھا جس سے کہ مسٹر چاؤ تھے۔اور ایک لحاظ سے تو وہ کامیاب امیدوار سے تین پشت سینئر تھا۔اس وقت کئی تماشائی آہ کیو کے احترام میں ذرا سے کھڑے بھی ہوگئے مگر اگلے دن ملازم نے اسے مسٹر چاؤ کے گھر بلالیا۔جب بوڑھے جنٹلمین کی نظر اس پہ پڑی تو اس کا چہرہ غصہ سے سرخ ہوگیا:

''تم آہ کیو، ذلیل حقیر کیڑے! کیا تم نے ایسا کہا تھا کہ تم اسی قبیلے میں سے ہو جس سے میرا تعلق ہے؟''۔

آہ کیو نے کوئی جواب نہیں دیا۔

مسٹر چاؤ جتنا زیادہ اسکی طرف دیکھتا اتنا زیادہ اس کا غصہ بڑھتا جاتا تھا۔اور کچھ قدم بڑھتے ہوئے اس نے کہا: ''تمھیں ایسی خرافات بکنے کی جرات کیسے ہوئی؟ میرا تم جیسا رشتے دار ہو کیسے سکتا ہے؟ کیا تمھارا خاندانی نام چاؤ ہے؟''۔

آہ کیو نے کوئی جواب نہ دیا۔وہ کھسکنے کی منصوبہ بندی کررہا تھا کہ مسٹر چاؤ آگے بڑھا اور اسکے منہ پہ ایک چانٹا رسید کردیا۔

''تمھیں چاؤ کیسے کہا جائیگا۔کیا تم سمجھتے ہو کہ تم چاؤ نام کے قابل ہو؟'' آہ کیو نے چاؤ نام کے حق کے دفاع کی کوئی کوشش نہ کی اور اپنا بایاں گال سہلاتے ہوئے سرکاری اہلکار کے ساتھ باہر نکل گیا۔باہر اسے سرکاری اہلکار سے گالیوں کی ایک اور بوچھاڑ سننا پڑی۔جس کسی نے بھی یہ کہانی سنی اس نے یہی کہا کہ آہ کیو احمق تھا کہ اس نے چاؤ کو اتنی مار کی دعوت دی۔حالانکہ لگتا نہ تھا مگر پھر بھی خواہ اس کا نام چاؤ تھا بھی تو اسے اس طرح کی ڈینگیں مارنے کی بجائے جاننا چاہیے تھا کہ گاؤں میں ایک ہی مسٹر چاؤ رہتے ہیں۔اس واقعہ کے بعد آہ کیو کے آباواجداد کا مزید کوئی تذکرہ نہ ہوا۔لہذا مجھے اب تک معلوم

نہیں ہے کہ اس کا خاندانی نام اصل میں تھا کیا۔

یہ مضمون لکھتے ہوئے مجھے تیسری مشکل یہ پیش آئی کہ آہ کیو کا شخصی نام کس طرح لکھا جائے۔ اس کی زندگی میں ہر شخص اسے آہ کیو ہی کہتا رہا، مگر اسکی موت کے بعد کسی نے بھی دوبارہ آہ کیو کا ذکر نہیں کیا۔ وجہ یہ تھی کہ وہ ان لوگوں میں سے نہ تھا جن کا نام ''ریشم اور بانس کے تختے پر محفوظ'' رکھا جائے۔ اگر اسکے نام کو محفوظ رکھنے کا کوئی سوال ہے بھی تو یہ مضمون اس سلسلے کی اولین کوشش ہے۔ چنانچہ مجھے شروع ہی سے اس دشواری کا سامنا ہے۔ میں نے اس معاملے پر بہت غور کیا: آہ کیوئی۔۔ کیا یہ وہی ''کیوئی'' ہے جس کا مطلب دار چینی ہے؟ یا پھر وہ ''کیوئی'' ہے جس کا مطلب اشرافیہ ہے؟۔ اگر اس کا دوسرا نام چاند محل ہوتا، یا اگر اس نے اپنی سالگرہ چاند میلہ کے مہینے میں منائی ہوتی، پھر تو یقیناً یہ دار چینی والا ''کیوئی'' تھا لیکن چونکہ اس کا دوسرا کوئی نام نہ تھا۔ اور اگر تھا تو کسی کو معلوم نہ تھا۔ چونکہ اس نے تعریفی اشعار حاصل کرنے کیلئے سالگرہ پر دعوت نامے بھی کبھی نہ بھیجے، اسلیے آہ کیوئی (دار چینی) لکھنا غلط ہوگا۔ پھر اگر اس کا آہ فیو (دولتمند) کے نام سے کوئی بڑا یا چھوٹا بھائی ہوتا تو یقیناً وہ آہ کیوئی (اشرافیہ) کہلاتا مگر وہ بالکل اکیلا تھا اسلیے اسے آہ کیوئی (اشرافیہ) لکھنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ کیوئی والے بقیہ سارے غیر معمولی الفاظ تو مزید غیر مناسب ہیں۔ میں نے ایک بار یہ سوال مسٹر چاؤ کے بیٹے سے کیا جو ایک کامیاب کاؤنٹی امیدوار تھا۔ مگر اس جیسا تعلیم یافتہ شخص بھی اس سوال سے چکرا گیا۔ اسکے بقول یہ نام تلاش نہیں ہوسکتا۔ آخری کوشش کرتے ہوئے میں نے اپنے علاقے کے ایک شخص کو آہ کیو کے معاملے کے قانونی مسودات کا ریکارڈ دیکھنے کو کہا۔ مگر آٹھ ماہ کے بعد اس نے مجھے خط لکھا کہ ریکارڈ میں آہ کیوئی نام کے کسی آدمی کا ذکر موجود نہیں ہے۔ مجھے یقین نہیں کہ یہ سچ تھا، بلکہ میرے دوست نے کچھ کیا ہی نہ تھا۔ چنانچہ نام کا نشان ڈھونڈنے میں ناکامی کے بعد میں اسے تلاش کرنے کے کسی اور ذریعے کا سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔ چونکہ میں جانتا ہوں کہ صوتیات کا نیا نظام ابھی تک عام استعمال میں نہیں آیا اسلیے مغربی حروف تہجی استعمال کرنے کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ یعنی نام کو انگریزی سپلنگ کے مطابق آہ کیوئی لکھا جائے اور اسے مختصراً آہ کیو لکھا جائے۔ یہ تو ''نیو یوتھ'' نامی رسالے کے موقف کو اندھا دھند تسلیم کرنے کے مترادف ہے اور میں ایسا کرتے ہوئے شرمندگی محسوس کر رہا ہوں۔ مگر چونکہ مسٹر چاؤ کے بیٹے جیسا تعلیم یافتہ شخص بھی میرا مسئلہ حل نہیں کر سکا تو میں اور کیا کرتا؟

میرا چوتھا مسئلہ آہ کیو کے آبائی وطن کے بارے میں تھا۔ اگر اس کا خاندانی نام چاؤ تھا تو ''لوگوں کی علاقائی درجہ بندی'' کے قدیم رواج کے مطابق جو کہ ابھی تک قائم ہے۔ ''سو خاندانی نام'' کے اندر دیکھنا چاہیے اور ''کانسو صوبہ میں تائن شوئی کا رہائشی'' ملے گا۔ مگر بدقسمتی سے یہ خاندانی نام متنازعہ ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ آہ کیو کی اصل جگہ بھی غیر واضح ہے۔ گو کہ وہ زیادہ تر وی چوآنگ میں رہا تھا، مگر وہ دوسری جگہوں میں بھی رہا تھا۔ لہذا اسے وی چوآنگ کا مقامی کہنا غلط ہوگا۔ یہ دراصل تاریخ کو بگاڑنے کی بات ہوگی۔

مجھے اطمینان دلانے کی واحد چیز یہ حقیقت ہے کہ لفظ ''آہ'' بالکل صحیح ہے۔ بلاشبہ یہ غلط عالمانہ تنقید کا سامنا اچھی طرح کر سکتا ہے۔ جہاں تک دوسرے مسائل کا تعلق ہے انھیں حل کرنا مجھ جیسے ان پڑھ لوگوں کا کام نہیں ہے۔ جبکہ میں صرف یہ توقع کر سکتا ہوں کہ ڈاکٹر ہوشیہہ کے شاگرد، جنہیں ''تاریخ اور قدیم اشیا سے لگاؤ'' ہے، مستقبل میں ان پہ نئی روشنی ڈال سکیں گے۔ البتہ مجھے خوف ہے کہ اس وقت تک میری ''آہ کیو کی سچی کہانی'' کب کا قصہِ پارینہ بن چکی ہوگی۔

باب دوئم

آہ کیو کی فتوحات کا مختصر جائزہ

آہ کیو کے خاندان، شخصی نام اور جائے پیدائش سے متعلق غیر یقینی کے علاوہ اس کے ''پس منظر'' سے متعلق بھی کچھ ابہام ہے۔ یہ اس لئے کہ وی چوآنگ کے لوگ اُس سے صرف کام لیتے تھے یا اسے ہنسی مذاق کا نشانہ بناتے تھے۔ جبکہ اس کے پس منظر پر ذرا بھی توجہ نہیں دیتے تھے۔ آہ کیو خود اس موضوع پر خاموش رہتا، سوائے اس کے کہ جب وہ کسی سے جھگڑ پڑتا تو اس کی طرف دیکھتا اور کہتا: ''ہم تمہاری نسبت بہت خوشحال ہوا کرتے تھے! تم اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہو؟''۔

آہ کیو کا کوئی خاندان نہیں تھا، وہ وی چوآنگ کے ایک مندر میں رہتا تھا۔ اس کے پاس کوئی باقاعدہ کام نہیں تھا، وہ محض دوسروں کے لئے جسمانی مشقت کا کام کیا کرتا تھا۔ گندم کی کٹائی مل جاتی تو وہ کرتا، چاول پیسنے ہوتے تو وہ پیستا، اگر چپو چلا کر کوئی کشتی چلانی پڑتی وہ چلاتا، اگر کام زیادہ عرصے کا ہوتا تو وہ اُس عارضی آقا کے گھر رہتا، لیکن جونہی کام ختم ہو جاتا وہاں سے چل پڑتا۔ اس لئے جب بھی لوگوں کو کوئی کام پڑتا وہ آہ کیو کو یاد کرتے۔ لیکن وہ اس کے کام کو یاد کرتے تھے، اسکے ''پس منظر'' کو نہیں۔ اور جس وقت کام ختم ہو جاتا تو وہ آہ کیو کو بھی بھول جاتے چہ جائیکہ اس کا ''پس منظر'' یاد رکھتے۔ البتہ ایک بار ایک بوڑھے شخص نے کہا ''آہ کیو بہت اچھا ورکر ہے''۔ اس وقت آہ کیو وہ جو کہ کمر تک ننگا تھا، نڈھال اور لاغر تھا، اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اور دوسرے لوگ نہیں جانتے تھے کہ ایسا سنجیدگی سے کہا گیا تھا یا تمسخر اڑانے کے لئے، مگر آہ کیو حد سے زیادہ خوش تھا۔

اُدھر آہ کیو، کو اپنے بارے میں بڑا زعم تھا۔ وہ وی چوآنگ کے رہنے والوں کو حقارت سے دیکھتا تھا، حتیٰ کہ اُن دو نوجوان سکالروں کو بھی ایک مسکراہٹ کے قابل بھی نہیں سمجھتا تھا۔ ''مسٹر چاؤ'' اور ''مسٹر چی ان'' کو گاؤں والے بہت عزت دیا کرتے تھے۔ اس لئے کہ امیر ہونے کے علاوہ وہ نوجوان سکالروں کے باپ بھی تھے۔ پورے گاؤں میں صرف آہ کیو ہی تھا جو یہ سوچ کر کہ ''میرے بیٹے ان سے زیادہ عظیم ہو سکتے ہیں''، انہیں استثنائی عزت نہیں دیتا تھا۔

مزید برآں آہ کیو کئی بار شہر جا چکا تھا، اس لئے فطری طور پر وہ مزید مغرور ہو گیا، گو کہ وہ شہر کے

لوگوں کو بھی انتہائی حقارت سے دیکھتا تھا۔ مثال کے طور پر تین فٹ تین انچ لکڑی کے تختے سے بنے بنچ کو جسے وی چوآنگ کے دیہاتی ایک ''بڑا بنچ'' کہتے تھے۔ آہ کیو بھی اسے ایک بڑا بنچ کہتا تھا۔ مگر شہر والے اسے ''سیدھا بنچ'' کہتے تھے، اور وہ سوچتا: ''یہ غلط ہے، کتنا مضحکہ خیز ہے!'' اسی طرح جب وہ بڑے سر والی مچھلی کو تیل میں بھونتے تو وی چوآنگ کے دیہاتی پیاز کے آدھا انچ لمبائی والے پتوں کو اس میں ملا دیتے تھے، جبکہ شہر والے باریک چھوٹے ٹکڑے کئے ہوئے پیاز ڈالتے تھے، اور وہ سوچتا: ''یہ بھی غلط ہے، کس قدر مضحکہ خیز!!'' مگر وی چوآنگ کے دیہاتی تو واقعی جاہل تھے جنہوں نے شہر میں فرائی کی ہوئی مچھلی بھی نہیں دیکھی تھی۔!

آہ کیو جو ''اچھا خاصا خوشحال ہوا کرتا تھا'' وہ دنیا کا آدمی تھا اور ''ایک اچھا ورکر تھا'' وہ تقریباً مکمل آدمی ہوتا اگر اس کے جسم پر کچھ بدنما داغ نہ ہوتے۔ ان میں سب زیادہ برے لگنے والے داغ اس کی کھوپڑی پر تھے جہاں ماضی میں چمکدار رنگ ورم کے نشان نمودار ہو چکے تھے۔ حالانکہ وہ اس کے اپنے سر پر تھے، بظاہر آہ کیو انہیں کسی صورت، عزت مآب نہیں سمجھتا تھا اس لئے کہ وہ لفظ رنگ ورم یا اس جیسی آواز پیدا کرنے والے کسی بھی لفظ کو استعمال کرنے سے پرہیز کرتا تھا۔ جب بھی اس کے لئے یہ لفظ استعمال کیا جاتا، خواہ جان بوجھ کر یا غیر ارادی طور پر، تو آہ کیو طیش میں آجاتا اور اس کے رنگ ورم والے نشان سرخ ہو جاتے۔ وہ گستاخی کرنے والے کو گھورتا اور اگر وہ دیکھنے میں کچھ کمزور ہوتا تو اسے برا بھلا کہتا۔ جبکہ وہ لڑنے میں کمزور ہوتا تو وہ اسے پیٹ بھی لیتا۔ پھر بھی، عجیب بات یہ تھی کہ عموماً آہ کیو ہی ان مقابلوں میں مار کھاتا۔ بالآخر اس نے نئے داؤ پیچ اختیار کئے، وہ خود کو عمومی طور پر غصے میں ظاہر کرتا۔

البتہ ہوا یہ کہ جب آہ کیو نے یہ غضبناک شکل بنائی تو وی چوآنگ کے بیکار لوگ اس کا مزید مذاق اڑانے لگے۔ جونہی وہ اسے دیکھتے تو وہ ایک حملے کا دکھاوا کرتے، اور کہتے:

''دیکھو دیکھو''

آہ کیو ہمیشہ کی طرح دھوکہ کھا کر اٹھ جاتا اور غضبناک شکل بناتا۔

''اچھا گدھے نے شیر کی کھال پہن رکھی ہے''۔ وہ مذاق اڑاتے ہوئے قہقہہ لگاتے۔

آہ کیو کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ محض یہ کہہ دیتا ''تم تو اس قابل بھی نہیں ہو''۔ اس موقع پر یوں لگتا جیسے اس کے سر پہ نشانات بہت مقدس، بہت عزت مآب تھے۔ بہرحال، جیسے کہ ہم کہہ چکے ہیں آہ کیو مین آف دی ورلڈ تھا۔ اسے یکدم پتہ چلتا کہ اس نے بہت خوبصورتی سے ایک پابندی، ایک رسم توڑ دی ہے اور وہ مزید کچھ کہنے سے کتراتا۔

اگر بے کار لوگ پھر بھی مطمئن نہ ہوتے، اور اسے اشتعال دلانا جاری رکھتے، تو پھر مکّے بازی پر اتر آتے۔ جب آہ کیو ہر طرح سے شکست کھا جاتا تو اس کی بھوری چٹیا کھینچ لی جاتی۔ اور اس کا سر چار پانچ دفعہ دیوار پر مارا جاتا۔ اس طرح بے روزگار فارغ لوگ اپنی جیت پر مطمئن ہو کر چلے جاتے۔ آہ کیو

ایک لمحہ کے لئے وہاں کھڑا رہتا، اور سوچتا ''یہ تو ایسا ہے جیسے میرا اپنا بیٹا مجھے پیٹے۔ دنیا کو آج کل کیا ہو گیا ہے؟۔۔۔'' تب وہ بھی اپنی جیت سے مطمئن وہاں سے چل دیتا۔

آہ کیو جو کچھ بھی سوچتا وہ یقیناً بعد میں لوگوں کو بتا دیتا، لہٰذا سارے لوگ جو آہ کیو کا مذاق اڑا چکے ہوتے جانتے تھے کہ اس کے پاس نفسیاتی فتح حاصل کرنے کا ایک وسیلہ ہے۔ اس لئے اس کے بعد جس کسی نے بھی اس کی بھوری چٹیا کھینچی یا مروڑی ہوتی تو وہ یہ کہتے ہوئے پیش بندی کرتا: ''آہ کیو، یہ بیٹے کا باپ کو پیٹنا نہیں ہے، یہ انسان کا درندے کو پیٹنا ہے۔ چلو تم کہو: ''ایک انسان ایک درندے کو پیٹ رہا ہے!''

تب آہ کیو اپنی چٹیا کی جڑ کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے، سر ایک طرف کو جھکائے، کہتا: ''ایک کیڑے کو پیٹنا کیسا رہے گا؟ میں ایک کیڑا ہوں۔۔۔ اب تو میرا پیچھا چھوڑو گے؟''

اگرچہ وہ ایک کیڑا تھا، لیکن فارغ لوگ اسے اس وقت تک جانے نہ دیتے جب تک وہ اپنی عادت کے مطابق اس کا سر کسی قریبی چیز پر پانچ چھ بار نہ مارتے، جس کے بعد وہ اپنی جیت پر مطمئن ہو کر چلے جاتے۔ البتہ چند ہی لمحوں میں آہ کیو بھی وہاں سے اس بات پر مطمئن چل دیتا کہ وہ جیت گیا ہے، یہ سوچتا ہوا کہ وہ ''اول درجے کا خود تحقیر آدمی'' ہے اور یہ کہ خود اپنی تحقیر کرنے کے بعد جو کچھ بچا وہ ''خاص الخاص'' تھا۔ کیا سرکاری امتحان میں سب سے زیادہ نمبروں سے پاس ہونے والا امیدوار بھی ''خاص الخاص'' تھا؟'' اور تم اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہو؟''۔

اپنے دشمنوں سے بھی اس طرح کے چالاک حربے استعمال کرنے کے بعد آہ کیو خوشی خوشی شراب خانہ چلا جاتا تا کہ چند پیالے شراب پیئے، دوسروں سے مذاق کرے، ان سے دوبارہ جھگڑا کرے، فاتح بن کر لوٹے اور مندر میں مسرور لوٹ آئے، اور وہاں جونہی اسکا سر بالش سے لگ جائے اسے نیند آئے۔ اگر اس کے پاس پیسہ ہوتا تو وہ جوا کھیلتا۔ چند آدمی زمین پر آلتی پالتی مارے بیٹھ جاتے، آہ کیو ان کے درمیان سینڈوچ ہو جاتا، اس کا چہرہ پسینے سے بھیگ جاتا، اور اس کی آواز بلند ترین سطح پر چیخ اٹھتی: ''سبز اژدھے پہ چار سو''۔

''اچھا۔۔ کھولو!'' مدمقابل جواری کا چہرہ بھی پسینے سے بھیگا ہوتا۔ بکس کھولتے ہوئے دعا کرتا ''یا آسمانی گیٹ۔۔۔ کونے کے لئے کچھ نہیں!۔۔۔ آہ کیو کے سکّے اِدھر کر دے!''

''راہداری۔۔۔ ایک سو۔۔۔ ایک سو پچاس''

ان دعاؤں والی قوالی پہ آہ کیو کا پیسہ رفتہ رفتہ دوسرے پسینے سے شرابور لوگوں کی جیبوں میں چلا جاتا۔ آخر کار وہ مجمعے میں سے سکڑتے ہوئے باہر نکلنے پر مجبور ہو جاتا اور ان کی پشت پر سے دیکھتا۔ وہ اس وقت تک کھیل کو گہری دلچسپی سے دیکھتا رہتا جب تک یہ ختم ہو جاتا۔ تب وہ بادل نخواستہ مندر کو لوٹ آتا۔ اگلے دن وہ سوجھی ہوئی آنکھوں کے ساتھ کام پر چلا جاتا۔

یہ وی چوآنگ میں دیوتاؤں کے جشن کی شام تھی۔ رواج کے مطابق ایک ڈرامہ ہونا تھا؛ اور

سٹیج کے قریب جوا کھیلنے کی بے شمار میزیں تھیں۔ڈرامہ کے ڈھول اور بتاشوں کی آوازیں تین میل دور آہ کیو تک کو سنائی دیں جو صرف جواریوں کی دعاؤں کو سنتا تھا۔سو وہاں پہنچا اور جوئے میں شامل ہو گیا۔وہ بار بار کامیابی سے بازی لگاتا، اس کے تانبے کے سکے چاندی میں بدلتے جاتے، اس کی چاندی ڈالروں میں اور اس کے ڈالر کا انبار اونچا ہوتا گیا۔جذبات سے وہ چیخا۔''آسمانی گیٹ پہ دو ڈالر''۔

اسے کبھی پتہ نہ چلا کہ لڑائی کس نے شروع کی اور اُس کی وجہ کیا تھی۔اس کے سر میں گالیوں، مکوں اور لاتوں کی آوازوں کا ایک مجموعہ۔۔۔اور جس وقت تک وہ ہانپتا کانپتا اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا جوئے کی میزیں ختم ہو چکی تھیں اور جواری بھی جا چکے تھے۔اس کے بدن کے کئی حصے درد کرنے لگے گویا اسے لاتوں گھونسوں سے پیٹا گیا تھا، جبکہ بہت سارے لوگ اس کی طرف حیرت سے دیکھ رہے تھے۔اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی چیز اپنی جگہ سے ہٹی ہوئی ہو، وہ اسی احساس کے ساتھ مندر کی جانب واپس چلا گیا۔اور جب تک اس کے حواس بحال ہو چکے تو اسے احساس ہوا کہ اس کے ڈالروں کا انبار غائب تھا۔چونکہ جشن پہ جوئے کی میزوں کو چلانے والے وی چوآنگ کے مقامی باشندے نہ تھے، اس لئے وہ مجرم کو کیسے تلاش کر سکتا تھا؟

تو چاندی کا سفید اور چمکدار انبار۔۔۔مگر اب یہ غائب تھا۔اب تو یہ سوچتے ہوئے بھی اسے اطمینان نہیں تھا کہ اس پر اس کے بیٹے نے ڈاکہ مارا۔خود کو کیڑا سوچتے ہوئے بھی اسے چین نہیں مل رہا تھا۔اس بار اس نے واقعی شکست کی تلخی جیسی چیز چکھی تھی۔

مگر وقتی طور پر اس نے شکست کو فتح میں بدل دیا۔اپنا دایاں ہاتھ اٹھا کر اس نے اپنے گال پر دو زوردار تھپڑ رسید کئے۔اتنے زور سے کہ گال درد سے سُن ہو گیا۔اس تھپڑ بازی کے بعد اس کا دل ہلکا ہوا۔اس لئے کہ لگتا تھا کہ اگر تھپڑ مارنے والا وہ خود تھا تو گویا اس نے کسی اور کو تھپڑ تو مار دیا، اور اسے جلد ہی لگا کہ اس نے کسی اور کو تھپڑ مارے۔۔۔اس حقیقت کے باوجود کہ اس کا گال ابھی تک سُن تھا وہ ایسے اطمینان سے لیٹا ہوا تھا جیسے کہ اس نے فتح پائی ہو۔

جلد ہی اسے نیند آ گئی۔

باب سوئم

آہ کیو کی فتوحات کی مزید تفصیل

گو کہ آہ کیو ہمیشہ فتوحات کر رہا تھا مگر مشہور اس وقت ہوا جب مسٹر چاؤ نے اس کے منہ پر تھپڑ مارا۔

سرکاری افسر کو نقد دو سو ادا کرنے کے بعد وہ ناراض لیٹ گیا۔بعد میں اس نے خود سے کہا ''آج کل دنیا کو کیا ہو رہا ہے، بیٹے باپ کو پیٹتے ہیں۔۔۔۔پھر مسٹر چاؤ (جو کہ اب اس کا بیٹا تھا) کے وقار کے بارے میں فکر نے اس کی طبیعت بحال کر دی اور وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور ''نوجوان بیوہ اپنے شوہر کی قبر پر

''نامی گیت گاتا ہوا شراب کی دکان میں چلا گیا۔

عجب بات یہ تھی اس واقعہ کے بعد ہر شخص اسے غیر معمولی عزت دینے لگا۔شاید اس نے اس تکریم کو اس حقیقت سے منسوب کیا کہ وہ مسٹر چاؤ کا باپ ہے، مگر اصل میں بات یہ نہ تھی۔وی چوآنگ میں، اصولی طور پر، اگر ساتواں بچہ آٹھویں بچے کو پیٹتا یا فلاں ''لی'' فلاں ''چانگ'' کو پیٹتا تو اسے بڑی بات شمار نہیں کیا جاتا تھا۔گاؤں والوں میں موضوعِ سخن بننے کیلئے مار پیٹ کو مسٹر چاؤ جیسی کسی اہم شخصیت سے جوڑنا ہوتا تھا۔لیکن جب ایک بار وہ اسے موضوعِ سخن بننے کے قابل سمجھ لیتے تو (چونکہ پیٹنے والا مشہور تھا) تو پٹنے والا کچھ نہ کچھ انعکاسی شہرت سے سرفراز ہو ہی جاتا۔جہاں تک آہ کیو کی غلطی کا تعلق ہے تو فطری بات ہے کہ غلطی تو اسی کی ہونی تھی۔اس لئے کہ مسٹر چاؤ تو غلط ہو ہی نہیں سکتے۔لیکن اگر آہ کیو قصوروار تھا تو پھر ہر شخص اسے غیر معمولی عزت کیوں دے رہا تھا؟ اس کی وضاحت مشکل ہے۔ہم یہ نظریہ پیش کر سکتے ہیں کہ اس لئے کہ آہ کیو نے کہا تھا کہ وہ اسی خاندان سے تعلق رکھتا ہے جس سے مسٹر چاؤ کا تعلق ہے۔لہٰذا گو کہ اسے مار پڑی تھی لوگ ابھی تک خوفزدہ تھے کہ شاید اس کی کہی ہوئی بات میں کچھ صداقت موجود ہو۔اس لئے وہ اسے کچھ عزت دے کر خود کو محفوظ سمجھتے تھے۔یا، متبادل طور پر یہ شاید کنفیوشسی مندر میں قربانی والے بیل کے گوشت والے معاملے کی طرح تھا، گو کہ بیل اسی درجے کا تھا جس طرح کہ قربانی والے سور، یا بھیڑ بکریاں تھیں۔لیکن بعد میں کنفیوشسی پیروکاروں نے اسے ہاتھ لگانے کی جرات نہ کی اس لئے کہ حکیم کنفیوشس نے اس کے مزے لئے تھے۔

اُس کے بعد آہ کیو کئی سالوں تک خوش وخرم رہا۔

ایک موسم بہار میں وہ نشے میں مسرور چلا جا رہا تھا کہ اس نے دیوار کے سائے میں موچھل وانگ کو بیٹھے دیکھا۔وہ کمر تک ننگا تھا اور جوئیں پکڑ رہا تھا۔اسے دیکھ کر آہ کیو کا جسم خارش کرنے لگا۔چونکہ موچھل وانگ خارش زدہ تھا، اور خارش کی بیماری سے پیدا شدہ زخموں کے داغوں سے اس کا بدن بھرا ہوا تھا اس لئے ہر شخص اسے ''داد کی بیماری والا موچھل وانگ'' کہتا تھا۔گو کہ آہ کیو نے لفظ ''رنگ ورم'' (داد کی بیماری) حذف کر لیا تھا مگر وہ اس شخص کو بہت نیچ خیال کرتا تھا۔آہ کیو محسوس کرتا تھا کہ خارش والے داغوں کے نشان کوئی خاص بات نہیں تھے، مگر اُس طرح کے گھنے بالوں والے گال واقعی زیادہ ہی انوکھے تھے، اور سوائے نفرت کے کچھ اور جذبہ ابھار ہی نہیں سکتے تھے۔اس لئے آہ کیو اس کے پہلو میں بیٹھ گیا۔اگر کوئی اور آوارہ گرد ہوتا تو، آہ کیو اس قدر بے پرواہی سے بیٹھنے کی جرات کبھی نہ کرتا، مگر اسے موچھل وانگ کے پہلو میں بیٹھنے سے بھلا کیا خوف ہو سکتا تھا؟

آہ کیو نے اپنی لکیر دار جیکٹ اتار دی اور اسے الٹا کر دیا لیکن یا تو اس نے حال ہی میں اسے دھویا تھا، یا وہ بہت زیادہ اناڑی تھا۔بہت تلاش کے بعد بھی اسے صرف تین یا چار جوئیں ملیں۔جبکہ اس کے مقابلے میں موچھل وانگ ایک کے بعد ایک جوں پکڑتا جاتا، اور ایک ہلکی آواز کے ساتھ انہیں اپنے

دانتوں کے بیچ کچل ڈالتا۔

آہ کیو کو پہلے تو مایوسی ہوئی۔حقیر موچھل وانگ اتنی زیادہ جوئیں پکڑ رہا تھا اور وہ خود اتنی تھوڑی ۔کس قدر شرم کی بات تھی۔اس نے ایک دو بڑی جوئیں پکڑنے کی کوشش کی مگر وہاں تھی ہی نہیں تو کیا ملتیں ۔بڑی مشکل کے بعد وہ ایک درمیانہ سائز والی جوں پکڑنے میں کامیاب ہوا جسے وہ تیزی سے اپنے منہ میں لے گیا اور وحشیانہ طور پر کاٹ مارا۔مگر اس سے بہت چھوٹی آواز پیدا ہوئی جو کہ پھر وانگ کی آوازوں سے بہت کمتر تھی۔

آہ کیو کے زخموں کے نشان سرخ ہو گئے ۔اپنی جیکٹ زمین پر پٹختے ہوئے تھوکا اور بولا :''بالوں والا کیڑا''۔

''کرم زدہ کتے!تم کس پر نام رکھ رہے ہو؟''موچھل وانگ حقارت سے اوپر دیکھتے ہوئے۔

گو کہ حالیہ برسوں میں ذرا زیادہ ملی ہوئی عزت نے آہ کیو کا غرور بڑھا دیا تھا مگر جب بھی اس کا سامنا لڑائی کے عادی لوفروں سے ہوتا تو وہ بھیگی بلی بن جاتا۔آج وہ استثنائی طور پر خود کو لڑاکا محسوس کر رہا تھا۔اس طرح کے بالوں بھرے گالوں والے نے اس کی توہین کی جرات کیسے کی؟

''اُسی پر جس پر یہ نام فٹ آ گیا ہے'' آہ کیو نے کھڑے ہو کر کولہوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''کیا تمہاری ہڈیاں خارش کر رہی ہیں؟''موچھل وانگ نے بھی کھڑے ہوتے ہوئے اور اپنی واسکٹ پہنتے ہوئے کہا۔

آہ کیو کو لگا جیسے وانگ بھاگنا چاہتا ہے۔وہ آگے بڑھا اور اسے مارنے کیلئے مکّا تان لیا۔مگر اس سے پہلے کہ اس کا لہراتا مکّا نیچے آتا موچھل وانگ اسے پہلے ہی قابو کر چکا تھا اور اسے ایک زوردار دھکا دے چکا تھا جس سے وہ لڑکھڑا گیا۔جب موچھل وانگ نے آہ کیو کی چٹیا قابو کر لی تو اس کا سر دیوار سے مارنے کیلئے اسے دیوار کی جانب کھینچنا شروع کیا۔

''شریف لوگ ہاتھوں کی بجائے اپنی زبان استعمال کرتے ہیں''۔آہ کیو نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔اس کا سر ایک طرف کو جھکا دیا گیا تھا۔

بظاہر موچھل وانگ کوئی شریف آدمی نہ تھا اس لئے کہ اس نے آہ کیو کے کہے پر ذرا سی توجہ بھی نہ دیتے ہوئے پانچ بار اس کا سر دیوار سے دے مارا اور اسے اتنے زور سے دھکیلا کہ وہ دو گز دور تک لڑکھڑاتا گیا۔تب کہیں موچھل وانگ اطمینان سے چلا گیا۔

جہاں تک آہ کیو کو یاد تھا، یہ زندگی میں اس کی پہلی توہین تھی۔اسلئے کہ وہ بدصورت داغوں بھرے گالوں کی وجہ سے موچھل وانگ کا مذاق اڑاتا تھا۔مگر کبھی بھی خود اس سے مذاق کا نشانہ نہیں بنا تھا۔آج تمام توقعات کے برعکس موچھل وانگ نے اس کی پٹائی کی تھی۔

آہ کیو وہاں متذبذب کھڑا رہا۔

دور سے آہ کیو کے دشمنوں میں سے ایک اور آتا نظر آیا۔یہ مسٹر چی این کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔آہ کیو اسے بھی بہت حقیر جانتا تھا۔شہر میں ایک غیر ملکی سکول میں تعلیم کے بعد جب وہ چھ ماہ بعد واپس گھر آیا تو اس کی ٹانگیں سیدھی تھیں، اس کی چٹیا غائب ہو چکی تھی۔اس کی ماں درجن بار روئی پیٹی اور اس کی بیوی نے تین بار کنوئیں میں چھلانگ لگانے کی کوشش کی۔بعد میں اس کی ماں ہر ایک کو بتاتی پھری کہ''نشے میں کسی بدمعاش نے اس کی چٹیا کاٹ دی۔وہ ایک سرکاری افسر بن سکتا تھا مگر اب اسے اس وقت تک انتظار کرنا ہوگا جب تک کہ اس کی چٹیا دوبارہ اگ نہیں جاتی''۔آہ کیو البتہ، اس کہانی پر اعتبار نہیں کرتا تھا اور اسے''نقلی غیر ملکی شیطان''اور''غیر ملکی تنخواہ کا غدار'' کہتا تھا۔جونہی آہ کیو اسے دیکھتا تو زیر لب برا بھلا کہنا شروع کر دیتا۔

آہ کیو کو اس میں جو چیز سب سے زیادہ ذلیل اور حقیر لگتی تھی وہ اس کی نقلی چٹیا تھی۔جب چٹیا ہی نقلی ہو تو آدمی انسان لگتا ہی نہیں۔اور یہ حقیقت کہ اس کی بیوی نے چوتھی بار کنوئیں میں چھلانگ لگانے کی کوشش نہیں کی تو اس سے ثابت ہو گیا کہ وہ بھی اچھی عورت نہ تھی۔

اب یہ''نقلی غیر ملکی شیطان'' قریب آ رہا تھا۔

ماضی میں آہ کیو صرف زیرِ لب''گنجے گدھے'' کہتا تھا مگر آج چونکہ اس کا موڈ خراب تھا اور وہ اپنے جذبات کا اظہار چاہتا تھا تو غیر ارادی طور پر یہ الفاظ اس کے منہ سے باہر پھسل آئے۔

بدقسمتی سے اس''گنجے'' نے ایک چمکدار بھوری چھڑی اٹھا رکھی تھی جسے آہ کیو''نوحہ گر کے ہاتھ میں لاٹھی'' کہتا تھا۔وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا آہ کیو پر جھپٹ پڑا۔جسے یکدم اندازہ ہو گیا کہ اُس کا پٹ جانا یقینی ہے۔وہ تیزی کے ساتھ اپنی تنی ہوئی پیٹھ کے ساتھ پٹنے کا انتظار کرنے لگا۔بالکل یقینی طور پر وہ ایک زوردار دھماکہ تھا جو اس کے سر پر نازل ہو ہی گیا۔

''میں تو اُسے کہہ رہا تھا''آہ کیو نے قریب کھڑے ایک بچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وضاحت کی۔

ٹھاک، ٹھاک، ٹھاک۔

جہاں تک آہ کیو کو یاد پڑتا تھا یہ زندگی میں اس کی دوسری توہین تھی۔خوش قسمتی سے جب یہ لاٹھی بازی رک گئی تو اسے ایسا لگا جیسے معاملہ ختم ہو گیا۔اسے کچھ چین سا بھی آ گیا۔مزید برآں، اس کے آباؤ اجداد سے ورثے میں ملی ہوئی''بھول جانے کی بیش بہا صلاحیت''اس پر عود کر آئی۔وہ آہستہ آہستہ چلا گیا اور شراب خانے کے دروازے تک پہنچتے پہنچتے دوبارہ خوش ہو چکا تھا۔

مگر عین اسی وقت کلیسا کی طرف سے ایک چھوٹی راہبہ اس کی طرف چلتی ہوئی آئی۔کسی راہبہ کو دیکھ کر آہ کیو پر دشمنی جیسا دورہ پڑ جاتا، اور وہ بھی ان توہینوں کے بعد؟ جونہی اسے خود پہ بیتی مار پیٹ یاد آئی تو اس کا غصہ پلٹ آیا۔

''اچھا، تو میری ساری بدقسمتیوں کا سبب یہ تھا کہ میں نے تمہیں دیکھنا تھا!''اس نے خود سے سوچا۔وہ اس کے قریب گیا اور بہت زور سے اس پر تھوک دیا''آآخ۔۔۔تھو!!''

چھوٹی سی راہبہ نے معمولی توجہ تک نہ دی بلکہ سر جھکائے چلتی رہی۔آہ کیو اس کے قریب چلا گیا۔اس کے تازہ ٹنڈ کرائے ہوئے سر پر تھپڑ جما دیا۔پھر احمقانہ انداز میں ہنستے ہوئے کہنے لگا:

''گنجی!۔فوراً واپس جاؤ،تمہارا راہب تمہارے انتظار میں ہے۔۔۔''

''تم کس چیز سے بنے جانور ہو؟۔۔۔۔''لال سرخ ہوتی ہوئی راہبہ نے قدم تیز کرتے ہوئے کہا۔

شراب خانے میں موجود لوگ قہقہے لگانے لگے۔آہ کیو نے دیکھا کہ اس کی حرکت کی تعریف ہو رہی ہے تو وہ اور پھیل گیا۔

''اگر راہب تمہیں چوپایہ بنا کر استعمال کرتا ہے تو میں کیوں نہیں کر سکتا؟'' یہ کہتے ہوئے اس نے لڑکی کی گال پر چٹکی کاٹی۔

شراب خانے میں لوگوں نے دوبارہ قہقہہ لگایا۔آہ کیو مزید خوش ہوا اور اُن لوگوں کو مزید مطمئن کرنے کیلئے اس نے دوبارہ اس کی سخت چٹکی کاٹی اور پھر اسے جانے دیا۔

اس مد بھیڑ کے دوران اسے موچھل وانگ اور نقلی غیر ملکی شیطان بھول گئے۔گویا دن بھر کی بد قسمتی کا انتقام لیا جا چکا تھا،اور یہ کہنا بہت عجیب ہے کہ وہ مار کھانے کے بعد مزید خوشگوار ہو گیا۔وہ اس قدر ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا گویا ہوا میں تیرنے کو تیار ہو۔

''آہ کیو خدا کرے تم بغیر بیٹے کے مر جاؤ!''۔دور سے چھوٹی راہبہ کی اشک آلود آواز آئی۔

آہ کیو نے پر مسرت قہقہہ لگایا۔

شراب خانے میں لوگوں نے بھی قہقہہ لگایا مگر یہ کم اطمینانی والا قہقہہ تھا۔

باب چہارم

عشق کی ٹریجڈی

کہتے ہیں کہ کچھ فاتح ایسے ہوتے ہیں جنہیں اس وقت تک فتح کی خوشی ہوتی ہی نہیں جب تک کہ ان کے مخالف شیروں اور عقابوں کی طرح مضبوط نہ ہوں۔اگر ان کے دشمن بھیڑوں یا مرغیوں کی طرح پالتو اور شیر میلے ہوں تو وہ اپنی فتح کو خالی خالی سمجھتے ہیں۔اور کچھ فاتح ایسے ہوتے ہیں جو فتح حاصل کر کے،دشمن کو تہہ تیغ کر کے یا مکمل مطیع بنا کر محسوس کرتے ہیں کہ اب کوئی دشمن،کوئی مخالف رہا ہی نہیں۔بس وہ ہی وہ ہیں،سپریم،مضبوط،مغموم،تنہا۔انہیں اپنی فتح ایک ٹریجڈی لگتی ہے۔مگر ہمارا ہیرو اس قدر بے حس نہ تھا۔وہ ہمیشہ مسرور و شاداں رہتا تھا۔یہ ملک چین کی بلند اخلاقی کا ایک ثبوت ہو سکتا ہے۔

آہ کیو کو دیکھیے،ہلکا پھلکا اور مسرور۔۔۔۔جیسے ابھی اڑنے کو ہو۔!۔

گو کہ یہ فتح عجیب نتائج سے خالی نہ تھی۔وہ کافی دیر تک اڑتا رہا۔اڑتا ہوا مندر گیا جہاں عام طور پر سر رکھتے ہی خراٹے لینے لگتا۔مگر اِس شام آنکھیں بند کرنے میں دِقت محسوس کر رہا تھا اسلئے کہ اسے

محسوس ہوا کہ جیسے اس کے انگوٹھے اور پہلی انگلی کے ساتھ کوئی مسئلہ ہے۔جو ہمیشہ کے برعکس ہموار لگ رہے تھے۔یہ کہنا ناممکن ہے کہ چھوٹی راہبہ کے چہرے پہ کوئی نرم اور ہموار چیز اس کی انگلیوں سے چپک گئی تھی،یا اس کی انگلیاں اس کے گالوں کے ساتھ لگ کر نرم ہو گئی تھیں۔

''آہ کیو،خدا کرے تم بن بیٹا مر جاؤ!''

یہ الفاظ آہ کیو کے کانوں میں دوبارہ گونجے اور اس نے سوچا،''ٹھیک بات ہے،مجھے ایک بیوی لینی چاہیے۔اس لئے کہ اگر کوئی شخص بغیر بیٹے کے مر جائے تو اس کی روح کیلئے چاول کا کٹورا تک خیرات کرنے والا کوئی نہ ہوگا۔۔۔۔مجھے ایک بیوی چاہیے۔''اور جیسا کہ ضرب المثل ہے''بے وارثی کے رویے کی تین قسمیں ہیں۔ان میں سب سے خراب''بے اولاد''ہونا ہے''۔اور یہ زندگی کی ٹریجڈیوں میں سے ایک ہے اسلئے کہ''بے اولاد روحیں بھوکی رہ جاتی ہیں''۔لہٰذا اس کا نکتہ نظر مکمل طور پر ولیوں کی تعلیمات کے مطابق تھا۔اور بلاشبہ یہ قابل ترس بات تھی کہ وہ آئندہ راہبہ کو تنگ کرے۔

''عورت،عورت!''اس نے سوچا۔

''پادری جانور بناتا ہے۔۔۔۔عورت،عورت!''۔اس نے دوبارہ سوچا۔

ہمیں کبھی معلوم نہ ہو سکے گا کہ اس شام آہ کیو کو کس وقت نیند آ گئی تھی۔البتہ اس کے بعد اسے شاید ہمیشہ اپنی انگلیاں نرم اور ہموار لگیں اور وہ ہمیشہ''عورت''سوچتا رہا۔

اس سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ عورت بنی نوعِ انسان کیلئے ایک وحشت ہے۔چینی مردوں کی اکثریت ولی ہو سکتی تھی اگر یہ بدقسمت حقیقت نہ ہوتی کہ انہیں عورت نے تباہ کر دیا۔شانگ سلطنت کو تاچی نے تباہ کر دیا تھا،چاؤ بادشاہت کو پاؤسزو نے برباد کر دیا تھا۔جہاں تک چن سلطنت کا تعلق ہے تو گو کہ اس بارے میں کوئی تاریخی شواہد موجود نہیں ہیں لیکن اگر ہم یہ فرض کریں کہ وہ کسی عورت کے حوالے سے گرگئی تھی تو ہم شاید غلط نہ ہوں۔اور یہ تو حقیقت ہے ہی کہ تنگ چاؤ کی موت تیاؤچن نامی عورت کی وجہ سے ہوئی تھی۔

آہ کیو بھی سخت اخلاقیات والا آدمی تھا۔گو کہ ہم نہیں جانتے کہ اسے کسی اچھے استاد کی رہنمائی حاصل تھی یا نہیں،اس نے ہمیشہ خود کو''جنسی امتیاز''پہ عمل کرنے میں سب سے زیادہ انتہا پسند ثابت کیا تھا۔اور چھوٹی راہبہ اور نقلی غیر ملکی شیطان جیسے خارجی بدعتی لوگوں کی مذمت کرنے میں آگے آگے تھا۔اس کا نکتہِ نظر یہ تھا کہ ساری راہباؤں کے پادریوں کے ساتھ خفیہ تعلقات ہیں۔اور یہ کہ اگر کوئی عورت گلی میں اکیلی جا رہی ہو تو وہ یقیناً برے آدمیوں کو بے عصمت کرنا چاہتی ہے۔جب ایک مرد اور عورت آپس میں باتیں کر رہے ہوں تو وہ یقیناً ملاقات کے انتظامات طے کر رہے ہیں''۔ایسے لوگوں کو ٹھیک کرنے کے لئے وہ غصے سے گھورتا،بلند آواز میں کاٹ ڈالنے والے تبصرے کرتا،اور اگر وہ جگہ غیر آباد ہوتی تو پیچھے سے ایک چھوٹا پتھر پھینکتا۔

کون کہہ سکتا ہے کہ تیس برس کی عمر میں جبکہ انسان کو''مضبوط رہنا''چاہیے،وہ ایک چھوٹی

راہبہ پہ دل ہارے گا؟ کلاسیکل مذہبی قوانین کے مطابق اس طرح کی وارفتگی سب سے بڑا گناہ ہے، لہٰذا عورتیں یقیناً قابل نفرت مخلوق ہیں۔ اس لئے کہ اگر چھوٹی راہبہ کا چہرہ نرم اور ہموار نہ ہوتا تو آہ کیو اس پہ فریفتہ نہ ہوتا۔ نہ ہی یہ وقوع پذیر ہوتا اگر چھوٹی راہبہ کا چہرہ کپڑے سے ڈھکا ہوتا۔ پانچ چھ برس قبل، ایک اوپن ایر اوپیرا دیکھتے ہوئے اس نے حاضرین میں سے ایک عورت کی ٹانگ کی چٹکی کاٹی تھی، لیکن چونکہ اس کی ٹانگ اس کی انگلیوں سے اس کی شلوار کے کپڑے کی وجہ سے جدا کی گئی تھی اس لئے اس کے بعد اسے اِس والی وارفتگی کا احساس نہیں ہوا تھا۔ البتہ چھوٹی راہبہ نے اپنا چہرہ نہیں ڈھانپا تھا، اور یہ بدعتیوں کے گناہ گار ہونے کا ایک اور ثبوت ہے۔

''عورت۔۔۔۔'' آہ کیو نے سوچا

اس نے ان عورتوں پہ قریبی نگاہ رکھی جنہیں وہ ''برے مردوں کی عصمت دری کرنا چاہتی ہیں'' سمجھتا تھا۔ مگر وہ اس کی طرف کبھی نہیں مسکراتیں۔ اس نے بہت احتیاط سے ان عورتوں کی باتیں سنیں جو اس کی باتیں کرتیں، مگر ان میں سے ایک نے بھی کبھی کسی خفیہ جائے ملاقات سے متعلق کوئی تذکرہ نہ کیا۔ آہ۔ یہ عورتوں کی گناہگاری کی ایک مثال اور سادہ مثال تھی۔ وہ سب جھوٹی انکساری کا دکھاوا کرتی تھیں۔

ایک روز جب آہ کیو مسٹر چاؤ کے گھر میں چاول پیس رہا تھا، تو وہ رات کا کھانا کھانے کے بعد باورچی خانے میں پائپ پینے کیلئے بیٹھ گیا۔ اگر یہ کسی اور کا گھر ہوتا تو وہ کھانا کھانے کے بعد گھر چلا جاتا مگر چاؤ کا خاندان بہت سویرے کھانا کھاتا تھا۔ اگرچہ اصول تھا کہ کھانا کھانے کے بعد آپ لیمپ نہ جلائیں بلکہ سونے چلے جائیں، کبھی کبھار اس اصول میں استثنائیں آجاتیں۔ مسٹر چاؤ کے بیٹے کو کاؤنٹی امتحان پاس کرنے سے قبل لیمپ جلا کر امتحان کی تیاری کرنے کی اجازت دی گئی تھی۔ اور جب آہ کیو کام کرنے چلا جاتا تو اسے چاول پیسنے کیلئے ایک لیمپ جلانے کی اجازت تھی۔ اصول میں اس آخری استثنا کی وجہ سے آہ کیو ابھی تک باورچی خانے میں بیٹھا کام جاری رکھنے سے قبل تمباکو نوشی کر رہا تھا۔

جب چاؤ گھرانے کی واحد ملازمہ آماہ وو نے برتن دھو لئے تو وہ بھی بینچ پر بیٹھ گئی اور آہ کیو سے باتیں کرنے لگی:

''ہماری مالکن نے دو دن سے کچھ نہیں کھایا اس لئے کہ مالک ایک داشتہ لانا چاہتا ہے۔۔۔۔''

''عورت۔۔۔۔ اماہ وو۔۔۔۔ یہ چھوٹی سی بیوہ'' آہ کیو نے سوچا ''ہماری چھوٹی مالکن چاند کی آٹھویں کو بچہ جنے گی۔۔۔۔''

''عورت۔۔۔۔'' آہ کیو نے سوچا۔ اس نے اپنا پائپ بجھا لیا اور اٹھ کھڑا ہوا

''ہماری چھوٹی مالکن۔۔۔۔۔'' اماہ وو بولتی جا رہی تھی۔

''میرے ساتھ سو جاؤ''۔ آہ کیو اچانک دوڑ کر آگے آیا اور خود کو اس کی قدموں میں گرا دیا۔

ایک لمحہ کو تو موت کی سی خاموشی چھا گئی

''آئی آ'' ایک گھڑی کیلئے بدحواس ''اماہ وو'' اچانک کانپنے لگی، پھر چیختی چلاتی باہر بھاگی اور جلد ہی اس کی سسکیاں سنائی دینے لگیں۔

دیوار کے مقابل گھٹنوں کے بل جھکا ہوا آہ کیو بھی بدحواس تھا۔ اس نے مضبوطی سے خالی بینچ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑا اور آہستہ کھڑا ہو گیا، اسے دھندلا سا احساس تھا کہ بات کچھ غلط ہو گئی ہے۔ دراصل اس وقت وہ خود بھی ایک لحاظ سے ہیجانی حالت میں تھا۔ گھبراہٹ میں اس نے اپنا پائپ اپنے بیلٹ کے ساتھ اڑس لیا اور واپس چاول کی طرف جانے کا فیصلہ کیا۔ مگر شڑاپ، ایک بھاری چیز اس کے سر پر آن لگی اور اس نے چکراتے ہوئے کامیاب کاؤنٹی امیدوار کو اپنے سامنے بانس کا ایک بڑا ڈنڈا تھامے کھڑا دیکھا

''تمہاری جرات۔۔۔۔ کیسے ہوئی۔۔۔۔''

بانس کا بڑا ڈنڈا آہ کیو کے سر پر آیا۔ اس نے سر کو بچانے کیلئے دونوں ہاتھ اٹھائے تو ڈنڈا اس کے ہاتھ کی پشت والی ہڈیوں پر لگا اور اسے شدید درد ہوا۔ اور باورچی خانے کے دروازے سے بھاگتے ہوئے اس کی پیٹھ پر بھی ایک ڈنڈا پڑ گیا تھا۔

''کھچوے کا انڈا!'' کامیاب امیدوار پیچھے سے چلّایا۔

آہ کیو بھاگ کر صحن میں آ گیا جہاں وہ اکیلا کھڑا تھا اور ابھی تک اپنے ہاتھ کی ہڈیوں میں درد محسوس کر رہا تھا۔ ابھی تک ''کچھوے کا انڈا'' کی بات یاد آ رہی تھی اس لئے کہ یہ ایک ایسی گالی تھی جسے وی چوآنگ گاؤں والے کبھی بھی استعمال نہیں کرتے تھے بلکہ صرف وہ امیر لوگ یہ گالی دیا کرتے تھے جو سرکاری زندگی سے کسی حد تک وابستہ ہوتے۔ اس سے وہ مزید خوفزدہ ہو گیا اور اس کے ذہن میں ایک انتہائی گہرا اثر پڑا۔ البتہ اب ''عورت۔۔۔۔'' کے بارے میں اس کے خیالات ہوا ہو چکے تھے۔ ان گالیوں اور مار پیٹ کے بعد لگتا تھا جیسے کوئی چیز ہو چکی ہو اور اس نے مطمئن دل کے ساتھ دوبارہ چاول پیسنے شروع کر دیئے۔ کچھ وقت تک پسائی کے بعد اسے گرمی محسوس ہوئی اور اپنی قمیض اتارنے کیلئے رکا۔

جس وقت وہ قمیض اتار رہا تھا اس نے باہر شور سنا۔ چونکہ آہ کیو ہمیشہ کسی پھڈے میں شامل ہونا پسند کرتا تھا، وہ آواز کی سمت باہر چلا گیا۔ یہ آواز مسٹر چاؤ کے گھر کے اندرونی احاطے سے آ رہی تھی۔ گو کہ اندھیرا ہونے لگا تھا مگر پھر بھی اسے کئی لوگ نظر آئے۔ چاؤ کا پورا خاندان بشمول مالکن کے جس نے دو دن سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ ان کے علاوہ ان کی پڑوسن مسز تساؤ بھی وہاں تھی۔ نیز ان کے عزیز چاؤ پائین اور چاؤ سز وچن بھی۔

نوجوان مالکن آماہ وو کو نوکروں کو یہ کہتے ہوئے کوارٹروں سے باہر لے جا رہی تھی ''باہر آ جاؤ۔۔۔۔ اپنے کمرے میں کڑک نہ رہو''۔

''ہر کوئی جانتا ہے کہ تم ایک اچھی عورت ہو''۔ مسز تساؤ باہر سے کہنے لگی

اماہ وو محض ماتم کر رہی تھی، وہ کچھ بڑبڑا رہی تھی جو کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

''دلچسپ ہے'' آہ کیو نے سوچا ''یہ چھوٹی بیوہ کیا شیطانی کر رہی ہوگی''؟ یہ جاننے کی خواہش میں وہ چاؤ سزوچن کے پاس پہنچ ہی رہا تھا کہ اچانک اس نے مسٹر چاؤ کے بڑے بیٹے کو اپنی طرف دوڑتے دیکھا۔ سب سے بری بات یہ تھی کہ بانس کا بڑا ڈنڈا اس کے ہاتھ میں تھا۔ بانس کا بڑا ڈنڈا دیکھتے ہی اسے یاد آیا کہ اسی ڈنڈے سے تو وہ پیٹا جا چکا تھا، اور اس نے جان لیا کہ اس پھڈے میں بھی وہ بظاہر شامل تھا۔ وہ مڑا اور بھاگا، اس امید میں کہ صحن تک بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ اسے یہ اندازہ نہ تھا کہ لمبا بانس اس کے پسپائی کی راہ کو مسدود کر دیگا، اسے جب اس کا اندازہ ہوا تو دوسری سمت بھاگا۔۔۔۔اور بہت کم وقت میں وہ دوبارہ مندر میں موجود تھا۔

جب آہ کیو تھوڑی دیر کیلئے بیٹھ گیا تو اس کی کھال پر راج ہنس والی شکنیں بننے لگیں اور اسے سردی محسوس ہوئی۔ اس لئے کہ اگرچہ یہ بہار کا موسم تھا، مگر راتیں ابھی تک اچھی خاصی سرد تھیں اور ننگی پیٹھ کیلئے موزوں نہ تھیں۔ اسے یاد آیا کہ اس نے اپنی قمیص چاؤ کے گھر میں چھوڑ دی۔ مگر اسے خوف تھا کہ اگر وہ اپنی قمیض لینے چلا گیا تو اسے ایک بار پھر کامیاب کاؤنٹی امیدوار کے بانس کے ڈنڈے کا مزہ چکھنا پڑے گا۔

پھر سرکاری اہلکار اندر آ گیا۔

''لعنت ہو تم پہ آہ کیو'' افسر بولا ''تم چاؤ خاندان کی نوکرانیوں تک کو بھی نہیں چھوڑتے۔ باغی! تم نے میری نیندیں اڑا دی ہیں، لعنت ہو تم پر!۔۔۔''

گالیوں کی اس بوچھاڑ میں ظاہر ہے کہ آہ کیو کے پاس کہنے کو کچھ نہ تھا۔ آخر کار، چونکہ رات پڑ گئی تھی، آہ کیو کو دگنی رقم دینی پڑی اور اس نے افسر کو چار سو نقد ادا کر دیے۔ چونکہ اس کے پاس پیسہ موجود نہ تھا اس لئے اس نے اپنی ٹوپی ضمانت کے طور پر رکھی اور پانچ شرائط ماننے پہ رضامند ہوا:

1- اگلی صبح آہ کیو کو ایک پونڈ وزن کی سرخ موم بتیوں کا ایک جوڑا، اور لوبان والی چھڑیوں کا ایک بنڈل لے کر اپنے کئے کی معافی کیلئے چاؤ خاندان جانا ہوگا۔
2- آہ کیو کو تاؤمت کے پادریوں کو معاوضہ دینا ہوگا جنہیں چاؤ خاندان نے بدروحوں کو بھگانے کیلئے بلایا تھا۔
3- آہ کیو آئندہ چاؤ کے گھرانے میں قدم نہیں رکھے گا۔
4- اگر اماہ وو سے کچھ بھی بدقسمتی ہو جائے تو آہ کیو کو ذمہ دار قرار دیا جائیگا۔
5- آہ کیو اپنی مزدوری یا قمیص کیلئے نہیں جائیگا۔

آہ کیو ظاہر ہے ہر شرط پر راضی ہو گیا لیکن اس کے پاس کوئی نقدی نہ تھی۔ خوش قسمتی سے یہ موسم بہار تھا اس لئے وہ اپنی رضائی کے بغیر گزارہ کر سکتا تھا جو اس نے دی گئی شرائط پورا کرنے کیلئے دو ہزار سکوں کے عوض رہن رکھوا لی۔ اپنی ننگی پیٹھ کے ساتھ کورنش بجالانے کے بعد اب بھی کچھ نقدی اس کے پاس بچی ہوئی تھی مگر ان پیسوں سے افسر سے اپنی ٹوپی واپس لینے کی بجائے اس نے سارے پیسے شراب

خوری میں خرچ کر دیئے۔

دراصل چاؤ خاندان نے نہ تو لوبان جلائے اور نہ ہی موم بتیاں، انہیں اس وقت استعمال کیا جا سکتا تھا جب بیگم صاحبہ مہاتما بدھ کی عبادت کرتیں۔ چنانچہ انہیں اس مقصد کیلئے الگ رکھا گیا۔ بوسیدہ قمیص کو بچے کیلئے پاجامہ بنانے کیلئے استعمال کیا گیا جو نوجوان بیگم کے ہاں چاند کی آٹھویں رات کو پیدا ہوئی جبکہ بقیہ کو اماہ وو نے جوتوں کے تلوے بنانے کیلئے استعمال کیا۔

تشریحات:

*''روحیں بھوکی رہتی ہیں''۔ قدیم کلاسیک ژوژوآن سے ایک قول۔

*''تا چی۔۔۔۔ تیاؤ چان''۔ بارہویں صدی ق م کی تا چی۔۔۔۔ شانگ عہد سلطنت کے آخری بادشاہ کی داشتہ تھی۔ آٹھویں صدی ق۔م کی پاؤ سزو مغربی چاؤ عہد سلطنت کے آخری بادشاہ کی داشتہ تھی۔ تیاؤ چن تیسری صدی کے ایک طاقتور وزیر تنگ چاؤ کی داشتہ تھی۔

*''مضبوط رہا''۔ کنفیوشس نے کہا تھا کہ تیس برس کی عمر میں وہ ''مضبوط رہا''۔ یہ فقرہ بعد میں اس بات کیلئے استعمال کیا گیا کہ ایک شخص کی عمر تیس برس ہے۔

باب پنجم

روزگار کا مسئلہ

جب آہ کیو کورنش بجالایا اور چاؤ خاندان کی شرائط تسلیم کیں، تو وہ حسبِ معمول مندر چلا گیا۔ سورج غروب ہو چکا تھا اور اس نے محسوس کرنا شروع کیا کہ کچھ گڑبڑ ہے۔ بہت غور کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی پشت ننگی ہے۔ جب اسے یاد آیا کہ اس کے پاس ابھی بھی ایک لکیر دار جیکٹ موجود ہے تو اس نے وہ پہن لی اور لیٹ گیا اور جب دوبارہ آنکھ کھولی تو سورج پہلے ہی مغربی دیوار کے اوپر چمک رہا تھا۔ اور یہ کہتے ہوئے اٹھ بیٹھا ''لعنت ہو۔۔۔۔''

جاگنے کے بعد وہ حسبِ معمول گلیوں میں آوارگی کرتا رہا۔ تب اس نے محسوس کیا کچھ اور بھی گڑبڑ ہے۔ گو کہ اس گڑبڑ کا مقابلہ ننگی پشت کی جسمانی تکلیف سے نہیں کیا جا سکتا۔ بظاہر بقیہ روزوی چوآنگ کی ساری عورتیں آہ کیو سے شرمانے لگیں۔ وہ جب اسے آتے دیکھتیں تو دروازے اندر سے بند کر دیتیں۔ حتیٰ کہ مسز تساؤ بھی جو کہ پچاس برس کی تھیں اپنی گیارہ سالہ بیٹی کو اندر بلاتے ہوئے، باقیوں کے ساتھ بدحواسی میں اندر چلی جاتیں۔ یہ سب کچھ آہ کیو کو بہت عجیب لگا۔ ''کتیائیں!'' اس نے سوچا ''وہ اچانک نوجوان بیگمات کی طرح شرمیلی بن گئی ہیں۔۔۔۔''

بہت دنوں بعد اس نے اور زیادہ شدت سے محسوس کیا کہ کچھ اور گڑبڑ بھی ہے۔ پہلے تو شراب خانے والے نے اسے قرض دینے سے انکار کیا، دوئم مندر کے انچارج بوڑھے شخص نے کچھ نامناسب

الفاظ کہے، جیسے کہ آہ کیو سے چلے جانے کا کہہ رہا ہو اور سوئم: بہت دنوں سے، اسے یاد نہ تھا کہ کتنے دنوں سے، اسے مزدوری پر لینے ایک شخص بھی نہ آیا تھا۔ شراب خانے کے قرض دینے سے انکار کو تو وہ برداشت کر سکتا تھا مگر کسی شخص کا اسے کرایہ پر لے جانے کے لئے نہ آنا تو اسے بھوکا رکھنے والی بات تھی۔ اور واقعی ایک ''عذاب'' والی حالت بھی۔

جب آہ کیو یہ سب برداشت نہ کر سکا تو وہ اپنے ریگولر مالک کے گھر چلا گیا کہ معلوم کرے کہ معاملہ کیا ہے۔۔۔۔ یہ صرف مسٹر چاؤ کا غصہ تھا جسے اسے عبور کرنے کی اجازت نہ تھی۔ اس کا بہت عجب انداز میں استقبال کیا گیا۔ ایک آدمی نمودار ہوا جو مکمل طور پر ناراض نظر آ رہا تھا! اس نے آہ کیو کی طرف یہ کہتے ہوئے ایسے بازو چلائے جیسے کہ وہ کوئی بھکاری ہو:

''یہاں کچھ بھی نہیں، بالکل کچھ نہیں۔ چلے جاؤ!''

آہ کیو کو یہ حرکت حد سے زیادہ غیر معمولی لگنے لگی ''ان لوگوں کو پہلے تو ہمیشہ مزدور کی ضرورت پڑتی رہی''۔ اس نے سوچا ''اچانک وہ بے کار کیسے ہو سکتے ہیں۔ دال میں کچھ کالا ضرور ہے''۔ محتاط تفتیش کے بعد اسے معلوم ہوا کہ جب بھی انہیں کوئی کام پڑتا تو وہ سب کے سب یو آنگ ڈی کو بلاتے۔ یہ یو آنگ ڈی ایک لاغر اور کمزور مفلس تھا، حتیٰ کہ آہ کیو کی نظروں میں موچھل وانگ سے بھی کمتر۔ کون تصور کر سکتا تھا کہ یہ کمتر شخص آہ کیو کی روزی اس سے چھینے گا۔ لہٰذا اس بار اس کیلئے آہ کیو کی حقارت ہمیشہ سے بھی زیادہ تھی۔ اور وہ راہ چلتے ہوئے آگ بگولہ ہوا۔ اس نے اچانک بازو ہوا میں لہرائے اور گانے لگا ''میں تمہیں ایک آہنی ڈنڈے سے پیٹوں گا۔۔۔۔''

چند دن بعد وہ واقعی مسٹر چی این کے گھر کے سامنے یو آنگ ڈی سے ملا۔ ''جب دو دشمن ملتے ہیں تو انکی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگتے ہیں''۔ جب آہ کیو اس تک گیا تو یو آنگ ڈی ساکت کھڑا تھا۔

''احمق گدھا'' آہ کیو منہ میں جھاگ بھرے انداز سے غضبناک طور پر اسے گھورتے ہوئے غرایا۔

''میں کیڑا ہوں۔ اس سے زیادہ حقارت کا اظہار کیا کروں؟'' یو آنگ ڈی بولا۔

اس طرح کی انکساری سے آہ کیو کو مزید غصہ آیا مگر چونکہ اس کے ہاتھ میں کوئی فولادی ڈنڈا نہ تھا تو وہ زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتا تھا کہ یو آنگ ڈی کی چوٹی پکڑنے کیلئے ہاتھ بڑھائے۔ وہ اس کی طرف دوڑ پڑا۔ یو آنگ ڈی ایک ہاتھ سے اپنی چوٹی بچا رہا تھا اور دوسرے ہاتھ سے اس نے آہ کیو کی چٹیا پکڑنے کی کوشش کی۔ جبکہ آہ کیو نے بھی ایک آزاد ہاتھ اپنی چٹیا بچانے کے لئے استعمال کیا۔ ماضی میں آہ کیو نے کبھی بھی یو آنگ ڈی کو سنجیدہ لینے کے قابل نہ سمجھا مگر اب جبکہ حال ہی میں وہ خود بھوک کا شکار ہو چکا تھا۔ اب وہ بھی اپنے مقابل کی طرح لاغر اور کمزور تھا۔ اسی طرح دونوں فریق تقریباً برابر کے جوڑ کے تھے۔ چار ہاتھ ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے، دونوں آدمی کمر کے بل جھکے اور چی این خاندان کی سفید دیوار پر نصف گھنٹہ سے زیادہ وقت تک نیلے قوس قزح کی شکل کا سایہ ڈالتے لڑتے رہے۔

''بس کرو، بس کرو''۔ تماشبینوں میں سے ایک نے کہا۔ شاید وہ انہیں چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''اچھا، اچھا'' دوسرے بولے، مگر یہ بات یقینی نہ تھی کہ وہ لڑنے والوں کو چھڑا رہے تھے یا مزید الجھنے کیلئے انہیں اکسا رہے تھے۔ البتہ دونوں گتھم گتھا افراد نے ان کی باتوں پر کوئی کان نہیں دھرا۔ اگر آہ کیو تین قدم آگے بڑھتا تو یو آنگ ڈی تین قدم پیچھے ہوتا، اور یوں یہ لڑائی جاری رہی۔ ٹائم بتانا مشکل تھا۔ شاید بیس منٹ ہو چکے ہوں گے کہ ان کے سروں سے بھاپ اٹھ رہا تھا اور پسینہ ان کی گالوں سے بہنے لگا۔ آہ کیو نے اپنے ہاتھ گرائے اور اسی لمحے یو آنگ ڈی کے ہاتھ میں بھی گر گئے۔ وہ بیک وقت سیدھے کھڑے ہو گئے اور ہجوم میں سے راستہ بناتے ہوئے بہ یک وقت پسپا ہو گئے۔

''میں تمہیں پھر دیکھوں گا۔۔۔۔'' آہ کیو نے منہ موڑ کر کہا۔

''میں تمہیں پھر دیکھوں گا۔۔۔۔'' یو آنگ ڈی نے بھی منہ پیچھے موڑ کر یہی کہا۔

یہ جنگ بظاہر نہ تو فتح پہ ختم ہوئی اور نہ شکست پہ، اور یہ معلوم نہیں کہ آیا تماشبین مطمئن ہوئے یا نہیں، اس لئے کہ کسی نے بھی رائے کا اظہار نہ کیا۔ مگر آہ کیو کو مزدوری دینے ایک انسان بھی نہ آیا۔

ایک روز جب ہوا کا ایک جھونکا موسم گرما کے خاتمے کا اعلان کرتا دکھائی دیا تو آہ کیو کو سردی محسوس ہوئی۔ مگر اس نے سردی کی پرواہ نہ کی۔ اس کی عظیم ترین پریشانی اس کا خالی معدہ تھا۔ اس کی کپاس کی رضائی اور قمیص تو کب کی غائب ہو چکی تھیں، ان کے بعد اس نے اپنی جیکٹ بھی فروخت کر دی تھی۔ اب پاجامے کے علاوہ کچھ نہ بچا تھا اور اسے وہ ظاہر ہے اتار نہیں سکتا تھا۔ یہ سچ ہے کہ اس کے پاس ایک پرانی دھاری دار جیکٹ تھی مگر یہ کسی قیمت کے قابل نہ تھی جب تک کہ وہ اسے پھٹے پرانے جوتوں سے بدل نہ دے۔ اسے بہت عرصے سے سڑک پہ گرا ہوا سکہ ملنے کی امید تھی مگر اس میں بھی کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ اسے اس بات کی بھی امید تھی کہ اپنے پرانے کمرے میں اچانک رقم کی کوئی تھیلی ملے گی، اور اس نے تلاش بھی خوب کیا مگر کمرہ بالکل خالی تھا۔ تب اس نے خوراک کی تلاش میں باہر نکلنے کا فیصلہ کر لیا۔ جب وہ خوراک کی تلاش میں سڑک پر چل رہا تھا تو اس نے جانا پہچانا شراب خانہ دیکھا اور جانی پہچانی بھاپ دیتی روٹی دیکھی مگر وہ ایک لمحہ رکے بغیر ان سے گزر گیا۔ وہ ان چیزوں کی تلاش میں نہ تھا گو کہ وہ خود نہیں جانتا تھا کہ اصل میں کس چیز کی تلاش میں تھا۔

چونکہ وی چوآنگ ایک بڑی جگہ نہ تھی، اس لئے جلد ہی وہ اس کے پیچھے رہ گیا۔ گاؤں کے مضافات میں دور دور تک چاول کے نازک پودوں کے کھیت تھے، جن کے درمیان کہیں کہیں حرکت کرتی سیاہ، گول چیزیں نظر آتی تھیں جو کہ کاشتکاری کرتے ہوئے کسان تھے۔ مگر دیہی زندگی کی مسرتوں کی طرف سے اندھا آہ کیو محض اپنی راہ چلتا رہا اس لئے کہ وہ جبلی طور پر جانتا تھا کہ اس کی ''تلاش برائے خوراک'' کا حل یہاں موجود نہیں ہے۔ بالآخر وہ ''خاموش خود اصلاحی والے کانونٹ'' پہنچا۔

کانونٹ بھی چاول کے کھیتوں میں گھرا ہوا تھا۔ اس کی سفید دیواریں سبزے کے پس منظر

میں آنکھوں کو چبھتی تھیں اور مٹی کی چھوٹی دیوار کے اندر سبزیوں کا ایک باغ تھا۔ آہ کیو ایک لمحہ کو جھجکا، ادھر ادھر دیکھا۔ چونکہ اسے کوئی بھی نظر نہ آیا تو وہ چھوٹی دیوار پر چڑھ گیا۔ کچے گارے کی دیوار لرزنے لگی اور آہ کیو خوف سے کانپنے لگا۔ البتہ ایک توت کے درخت کی شاخ کو پکڑ کر وہ اسے پھلانگنے میں کامیاب ہوا۔ اندر خوب سبزہ تھا مگر زرد شراب، روٹی یا کوئی اور کھانے کی چیز کے آثار نہ تھے۔ نوخیز شاخوں والے کچھ بانس کے درخت مغربی دیوار کے قریب موجود تھے مگر بدقسمتی سے یہ شاخیں ابلی ہوئی نہ تھیں۔ وہاں گنوار بھی تھا جس کی بہت عرصہ قبل تخم ریزی کی گئی تھی۔ سرسوں کے پہلے ہی پھول لگ چکے تھے اور چھوٹی گوبھی کے پودے، بہت سخت لگ رہے تھے۔

آہ کیو اُس طالب علم کی طرح جھنجھلایا ہوا تھا جو امتحان میں فیل ہو گیا ہو۔ جوں جوں وہ باغ کے گیٹ کی طرف آہستہ آہستہ چلتا رہا تو اسے مسرت ہوتی گئی اس لئے کہ اسے اپنے سامنے شلغموں کا ایک قطعہ نظر آیا۔ وہ نیچے جھکا اور انہیں اکھاڑنا شروع کیا جب اچانک گیٹ کے پیچھے سے ایک گول سر نمودار ہوا اور پھر اچانک چھپ گیا۔ یہ بوڑھی راہبہ کے علاوہ کوئی اور نہ تھی۔ گو کہ آہ کیو کو راہباؤں سے حد سے زیادہ نفرت ہوا کرتی تھی مگر، کچھ لمحے ایسے آتے ہیں جب دور اندیشی بہادری کا بہتر حصہ ہوتی ہے۔ اس نے تیزی سے چار شلغم نکالے، پتوں کو توڑ دیا اور انہیں اپنی جیکٹ میں ٹھونس دیا۔ مگر اس وقت تک بوڑھی راہبہ باہر آ چکی تھی۔

''مہاتما بدھ کی پناہ، آہ کیو تمہیں کیا ہو گیا کہ ہمارے باغ میں پھلانگ کر شلغم چراؤ! اوڈیئر تم کیسی مکار چیز ہو، اوڈیئر، مہاتما بدھ کی پناہ۔۔۔۔''

''میں کب تمہارا باغ پھلانگا ہوں اور کب شلغم چرائے ہیں؟'' آہ کیو نے اس کی طرف نظریں گاڑے بھاگتے ہوئے کہا۔

''ابھی'' بوڑھی راہبہ نے اس کی جیکٹ کی تہوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا

''کیا یہ تمہارے ہیں؟ کیا تم ان سے یہی کہلوا سکو گی؟ تم۔۔۔۔''

اپنا فقرہ ادھورا چھوڑ کے آہ کیو جس قدر تیز دوڑ سکتا تھا بھاگا۔ اس کے پیچھے ایک موٹا کالا کتا لگ گیا تھا۔ اصل میں یہ کتا سامنے کے گیٹ پہ تھا اور اب پچھلے گیٹ پر کیسے پہنچا تھا، یہ ایک معمہ تھا۔ ایک غراہٹ کے ساتھ کالا کتا تعاقب کر رہا تھا اور آہ کیو کی ٹانگ کو کاٹنے والا ہی تھا کہ عین موقع پر اس کی جیکٹ سے ایک شلغم گر گیا اور کتا حیرانگی میں ایک لمحے کیلئے رک گیا۔ اسی دوران آہ کیو توت کے درخت پر چڑھا، کچی دیوار پھاندی اور شلغموں کے ساتھ کانونٹ سے باہر گر گیا۔ اسے کالا کتا ابھی تک توت کے درخت کے پاس بھونکتا ہوا، اور بوڑھی راہبہ کی دعائیہ آواز بھی۔

اس ڈر سے کہ راہبہ کتے کو دوبارہ اس پر چھوڑ دے آہ کیو نے اپنے شلغم اکھٹے کئے اور بھاگا۔ کچھ پتھر بھی اس نے ہاتھوں میں اٹھا لئے۔ مگر کالا کتا دوبارہ نمودار نہ ہوا۔ آہ کیو نے پتھر پھینک دیئے اور

چلتا گیا اور کھاتے ہوئے سوچنے لگا: ''یہاں کچھ نہیں رکھا، اسے شہر جانا چاہیے۔۔۔۔''

جب تک اس نے تیسرا شلغم ختم کر دیا اس نے شہر جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

باب ششم

بحالی سے تنزلی تک

وی چوآنگ نے اس برس آہ کیو کو چاند میلہ کے بعد تک دوبارہ نہیں دیکھا۔ ہر شخص اس کی واپسی کا سُن کر حیران تھا۔ وہ سب سوچنے لگے کہ اس نے یہ سارا عرصہ کہاں گزارا ہو گا۔ ماضی میں کچھ موقعوں پر جب وہ شہر جاتا تھا تو بڑے کروفّر کے ساتھ لوگوں کو پیشگی بتایا کرتا۔ مگر چونکہ اس بار اس نے ایسا نہیں کیا اس لئے اس کے چلے جانے کو کسی نے محسوس نہیں کیا۔ اس نے مندر کے بوڑھے انچارج کو بتایا ہو گا مگر وی چوآنگ کے رواج کے مطابق صرف مسٹر چاؤ، مسٹر چی ین، یا پھر کامیاب کاؤنٹی امیدوار جب شہر جاتے تو اہم بات ہوتی۔ حتیٰ کہ نقلی غیر ملکی شیطان کے جانے پر بھی گفتگو نہ ہوتی۔ تو بھلا آہ کیو کے جانے کی کیا اہمیت ہو سکتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ بوڑھے آدمی نے اس کے جانے کی خبر نہیں پھیلائی۔

آہ کیو کی اس بار کی واپسی پچھلی واپسیوں سے مختلف تھی۔ درحقیقت یہ واپسی حیران کن تھی۔ دن ڈھل رہا تھا جب وہ نیند سے بوجھل آنکھوں کے ساتھ شراب خانے کے دروازے پر نمودار ہوا۔ وہ کاؤنٹر تک گیا، نیفے سے چاندی اور جست کے مٹھی بھر سکے نکالے اور انہیں کاؤنٹر پر پھیلا دیا:

''نقدی'' اس نے کہا کہ ''شراب لاؤ''۔ اس نے ایک نئی لکیر دار جیکٹ پہن رکھی تھی اور اس کی کمر سے ایک بہت بڑا بٹوہ لٹکتا نظر آ رہا تھا جس کے بھاری بوجھ سے اس کی بیلٹ کھچ کر ٹیڑھی ہو چکی تھی۔ وی چوآنگ میں رواج تھا کہ جب کسی کے بارے میں کوئی غیر معمولی پن نظر آتا تو اس کے ساتھ عزت سے پیش آیا جاتا۔ اب گو کہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ آہ کیو تھا، مگر پھر بھی پرانے کوٹ والا آہ کیو تو نہیں تھا۔ بوڑھے لوگ کہتے تھے: ''جو سکا لر تین دن تک غائب رہا ہو اسے نئی آنکھوں کے ساتھ دیکھنا چاہیے'' اس لئے فطری طور پر ویٹر، سرائے والا، گاہک اور راہ گیر سب تجسس اور احترام کے ملے جلے جذبات کا اظہار کر رہے تھے۔ سرائے والے نے سر ہلاتے ہوئے کہا:

''آہ کیو تم واپس آ گئے ہو؟''

''ہاں''۔

''تم نے پیسہ کمایا۔۔۔۔ کہاں؟''

''میں شہر گیا تھا''۔

دوسرے دن یہ خبر سارے گاؤں میں پھیل چکی تھی۔ اور شراب خانے، چائے کے ہوٹل اور مندر میں ہر شخص آہ کیو کے کامیاب پیسہ اور نئے لکیر دار کوٹ کی کہانی سننا چاہتا تھا۔ گاؤں بھر میں بتدریج

یہ خبر پھیل گئی۔نتیجہ یہ نکلا کہ سارا گاؤں آہ کیو سے بہتر سلوک کرنے لگا۔

آہ کیو کے بقول وہ ایک کامیاب صوبائی امیدوار کے ہاں ملازم رہا۔اس کامیاب صوبائی امیدوار کا نام ''پائی'' تھا مگر چونکہ وہ سارے شہر میں واحد کامیاب امیدوار تھا اس لئے اسے خاندانی نام استعمال کرنے کی ضرورت نہ تھی۔لہٰذا جب بھی کامیاب امیدوار کی بات کی جاتی تو اس کا مطلب ہی ''پائی'' ہوتا۔ایک ایسے شخص کے گھر میں کام کرنا ظاہر ہے کہ عزت کی بات تھی۔مگر آہ کیو کی مزید تفصیل کے مطابق وہ وہاں کام کرنے پر خوش نہ تھا اس لئے کہ کامیاب امیدوار واقعی بہت زیادہ ''کچھوے کا انڈہ'' تھا۔کہانی کا یہ حصہ جس کسی نے بھی سنا، ایک ٹھنڈی آہ نکالی۔۔۔۔مگر ایک مسرت کے احساس کے ساتھ۔اس لئے کہ اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ آہ کیو دراصل ایک ایسے شخص کے ہاں کام کرنے کا اہل ہی نہ تھا۔

آہ کیو کا کہنا تھا کہ اس کی واپسی شہری لوگوں سے اس کی عدم اطمینانی کے سبب ہوئی۔اس لئے کہ وہ لوگ ایک لمبے بنچ کو ''سیدھا بنچ'' کہتے تھے، مچھلی فرائی کرنے کیلئے باریک کٹے پیاز استعمال کرتے تھے، اور عورتیں چلتی ہوئی بہت ہی اطمینان بخش طور پر لہراتی نہ تھیں۔البتہ شہر کی اپنی خوبیاں ہیں۔مثلاً وی چوآ نگ میں تو ہر شخص بانس کے 32 خانوں والا کھیل کھیلتا تھا۔اور صرف نقلی غیر ملکی شیطان ''ماہ جونگ'' کھیل سکتا تھا۔مگر شہر میں تو گلی کے عام لوگ بھی ''ماہ جونگ'' میں ماہر تھے۔اگر آپ نقلی غیر ملکی شیطان کو گلی کے ان عام کھلاڑیوں کے حوالے کر دیں تو اسے دو منٹ میں دوزخ کے بادشاہ کے سامنے ایک معمولی شیطان بنا دینگے۔

''کیا تم نے کوئی سزائے موت دیکھی؟'' آہ کیو نے جواب دیا'' آہ، وہ زبردست منظر ہوتا ہے۔۔۔۔'' جونہی اس نے سر ہلایا اس کی رال چاؤ سوچن کے منہ پر گری جو اس کے عین مقابل کھڑا تھا۔کہانی کے اس حصے پر حاضرین کانپ اٹھے۔اس نے اردگرد دیکھا، اچانک اپنا داہنا ہاتھ اوپر اٹھایا اور موچھل وانگ کی گردن پر گرایا جو کہ سر آگے کی طرف جھکائے انتہائی توجہ سے سن رہا تھا۔

''قتل کردو'' آہ کیو چیخا۔

موچھل وانگ نے برق رفتاری سے اپنا سر ہٹا لیا جیسے چقماق سے چنگاری نکلی ہو۔دیگر حاضرین مسرت آمیز خدشہ سے کانپ اٹھے۔اس کے بعد موچھل وانگ کئی روز تک بدحواسی میں پھرتا رہا اور آہ کیو کے قریب جانے کی جرات نہ کر سکا۔باقی لوگوں کا بھی یہی حال تھا۔

گو کہ ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ وی چوآ نگ کے باشندوں کی نظر میں اس وقت آہ کیو کا مقام مسٹر چاؤ جتنا بلند تھا، البتہ بلاتردید یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان دونوں کا مرتبہ برابر کا تھا۔

اس کے بعد زیادہ عرصہ نہ گزرا کہ آہ کیو کی شہرت وی چوآ نگ کی عورتوں میں بھی پھیلنے لگی۔گو کہ وی چوآ نگ میں دکھاوے کے قابل دو ہی خاندان تھے یعنی چی اِن اور چاؤ خاندان۔بقیہ آبادی کا 9\10 حصہ غریب تھا۔پھر بھی عورتیں عورتیں ہوتی ہیں۔اور جس طرح آہ کیو کی شہرت ان میں پھیلی وہ

ایک معجزہ تھا۔عورتیں ایک دوسرے سے ملتیں تو کہنے لگتیں: مسز تساؤ نے آہ کیو سے ایک نیلی سلک کا سکرٹ خریدا ہے۔گو کہ وہ پرانی ہے مگر صرف نوے سینٹ پر ملی۔اور چاؤ پائی ین کی ماں (ابھی اس بات کی تصدیق ہونی تھی اس لئے کہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ چاؤ سزوچن کی ماں تھی) نے سرخ غیر ملکی چھینٹ کا بچوں کا ایک لباس صرف تین سو میں خریدا جس میں آٹھ فیصد رعایت بھی شامل ہے۔وہ تقریباً بالکل نئی ہے۔

پھر وہ عورتیں جن کے پاس سلک سکرٹ نہیں تھی یا جو غیر ملکی چھینٹ کی ضرورت مند تھیں، بہت بے چینی سے آہ کیو کو دیکھنا چاہتی تھیں تاکہ اس سے خریداری کر سکیں۔اب وہ اس سے لاپرواہی برتنے کی بجائے، کبھی کبھی اس کے پیچھے چلتیں اور اسے رکنے کا کہتیں۔

''آہ کیو، تمہارے پاس اور بھی سلک سکرٹ ہیں؟'' وہ پوچھتیں۔

۔''نہیں؟ ہمیں غیر ملکی چھینٹ کا کپڑا بھی چاہیے۔تمہارے پاس ہیں؟''

یہ خبر غریب گھروں سے امیر گھرانوں تک پہنچ گئی اس لئے کہ مسز تساؤ اپنی سلک سکرٹ سے اس قدر خوش تھیں کہ وہ اسے مسز چاؤ کو دکھانے لے گئیں اور مسز چاؤ نے اس کی بہت تعریف کی۔

چاؤ نے اس شام ڈنر پر اپنے بیٹے سے اس معاملے پر بات کی جو کہ کامیاب کا وَنٹی امیدوار تھا۔اس نے تجویز دی کہ آہ کیو کے بارے میں تحقیق کی جائے۔گو کہ وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ آہ کیو کے پاس کچھ بچا یا نہیں۔چونکہ مسز چاؤ کو ایک اچھی اور سستی فرکوٹ کی خواہش تھی اس لئے خاندان کی میٹنگ کے بعد فیصلہ ہوا کہ مسز تساؤ سے فوراً آہ کیو کو ڈھونڈنے کا کہا جائے۔اس کے لئے معاہدے کی تیسری شق کو ختم کیا گیا۔یعنی اب اسے اُس شام لیمپ جلانے کی خصوصی اجازت دی گئی۔

اچھا خاصا تیل جلایا گیا مگر اُس کے باوجود آہ کیو کے کوئی آثار نہ تھے۔سارا چاؤ خاندان بے صبری میں جمائیاں لے رہا تھا۔کچھ آہ کیو کے غیر منظم طور طریقوں کو کوس رہے تھے، کچھ غصہ سے مسز تساؤ پر الزام لگا رہے تھے کہ وہ اسے یہاں لانے کی کوشش نہیں کر رہی۔مسز چاؤ کو خوف تھا کہ آہ کیو گذشتہ بہار میں لگائی گئی پابندیوں کی وجہ سے آنے کی جرات نہیں کر رہا ہوگا، مگر مسٹر چاؤ کا خیال تھا کہ ایسی بات نہیں ہے۔اس لئے کہ بقول اس کے ''اس بار میں نے اسے بلایا ہے'' مسٹر چاؤ بصیرت والے نکلے۔اس لئے کہ آہ کیو بالآخر مسز تساؤ کے ساتھ پہنچ گیا۔

''وہ مسلسل کہے جا رہا ہے کہ اس کے پاس کچھ نہیں بچا'' مسز تساؤ نے ہانپتے ہوئے کہا۔''جب میں نے اس سے یہاں آنے اور خود آپ کو بتانے کا کہا تو وہ یہی بڑبڑاتا آیا۔میں نے اسے بتایا۔۔''

''سر'' آہ کیو نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''آہ کیو۔میں نے سنا ہے کہ تم وہاں امیر بن گئے ہو'' مسٹر چاؤ نے اس کے پاس جا کر اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔''بہت اچھے۔اب۔۔۔۔۔وہ کہتے ہیں کہ تمہارے پاس کچھ پرانی چیزیں ہیں۔۔۔تم وہ سب ہمیں دکھانے یہاں لے آؤ۔۔۔۔اس لئے کہ میں چاہتا ہوں۔۔۔۔۔''

''میں مسٹر تساؤ کو بتا چکا ہوں۔۔۔۔اب کچھ بھی نہیں بچا''

''کچھ نہیں بچا؟''مسٹر چاؤ اپنی ناراضگی کو نہ دبا سکا۔''اتنی جلدی وہ کیسے ختم ہوگئیں؟''

''کچھ تو بچا بھی ہوگا''

''صرف دروازے کا ایک پردہ بچ گیا''۔

''تو وہی پردہ ہمیں دکھانے لاؤ''مسز چاؤ نے جلدی جلدی کہا۔

''چلو،کل لے آؤ۔مسٹر چاؤ نے کسی اشتیاق کے بغیر کہا''آئندہ جب بھی تمہارے پاس کچھ ہو آہ کیو،تو پہلے پہل ہمارے پاس لے آؤ۔۔۔۔''

''ہم تمہیں دوسرے لوگوں کی بہ نسبت کم قیمت نہیں دیں گے''۔کامیاب کاؤنٹی امیدوار نے کہا۔اس کی بیوی نے آہ کیو کا ردعمل دیکھنے کیلئے فوراًاس پر نظر دوڑائی۔

''مجھے فر کا ایک کوٹ چاہیئے''۔مسز چاؤ نے کہا۔

گو کہ آہ کیو راضی ہوگیا مگر اس نے اس قدر بے پرواہی سے سر ہلایا کہ وہ لوگ جان نہ سکے کہ وہ ان کی باتوں کو گرہ میں باندھ چکا ہے یا نہیں۔مسٹر چاؤ اس قدر مایوس،ناراض اور پریشان ہوگیا کہ اس نے جمائی لینی بھی چھوڑ دی۔کاؤنٹی کامیاب امیدوار بھی آہ کیو کے رویے سے غیر مطمئن ہوا اور کہا''لوگوں کو ایسے'' کچھوے کے انڈے'' سے ہوشیار رہنا چاہیے۔بہتر ہوگا کہ سرکاری افسر کو حکم دیا جائے کہ اس کے وی چوآ نگ میں رہنے پر پابندی لگا دے''۔

مسٹر چاؤ نے یہ کہہ کر اس سے اتفاق نہیں کیا۔اس سے لوگوں میں ذاتیات کا تاثر پھیل جائیگا اور اس طرح کے اقدام سے شاید یہ'' شاہین خود اپنے گھونسلے پہ شکار نہیں کھیلتا''والا معاملہ ہو جائے ۔کامیاب کاؤنٹی امیدوار باپ کی دلیل سے متاثر ہوا اور آہ کیو کو گاؤں سے نکالنے کی تجویز سے دستبردار ہو گیا مگر مسز تساؤ کو خبردار کیا کہ اس کی بات کو کہیں اور نہ دھرائے۔

البتہ اگلے روز جب مسز تساؤ نے اپنی نیلی سکرٹ کا لارنگ دینے کیلئے اٹھالی تو اس نے آہ کیو کے بارے میں وہ باتیں بتادیں۔ہو بہو تو نہیں لیکن پھر بھی اس کی باتیں آہ کیو کیلئے تباہ کن تھیں۔پہلی بات تو یہ ہے کہ سرکاری افسر آیا اور دروازے کا پردہ اس سے لے گیا۔گو کہ آہ کیو نے احتجاج کیا کہ مسز چاؤ اسے دیکھنا چاہتی ہیں۔مگر سرکاری افسر نے وہ واپس نہ کیا بلکہ الٹا مطالبہ کیا کہ کسی قسم کی کارروائی سے بچنے کیلئے ادائیگی کیا کرے۔ان باتوں سے گاؤں والوں کے ہاں اس کی تکریم اچانک ختم ہوئی۔گو کہ وہ ابھی تک اس سے بدتمیزی کرنے کی جرات نہیں کر سکے مگر حتی الوسع اس سے کتراتے۔ان کا یہ رویہ قدما کی روح کے ساتھ رویے سے ملتا جلتا تھا:وہ ایک مودبانہ فاصلہ رکھتے تھے۔

کچھ بے کار لوگ جو اس کاروبار کی تہہ تک پہنچنا چاہتے تھے،آہ کیو سے محتاط سوال جواب کرنے لگے۔آہ کیو نے کچھ بھی نہ چھپایا اور فخر سے انہیں اپنے تجربات بتائے۔انہیں معلوم ہوا کہ وہ تو وہاں

محض چوریاں کرتا رہا تھا۔بالآخر جب سرکاری کارندے اسے پکڑنے کو تھے تو وہ شہر چھوڑ کر واپس وی چوآ نگ بھاگ آیا۔اس قصے نے آہ کیو کی ساکھ مزید تباہ کر دی۔گاؤں والے تو اس سے ایک مودبانہ فاصلہ اسلئے رکھے ہوئے تھے کہ وہ اس کی دشمنی مول لینا نہیں چاہتے تھے۔کسے اندازہ ہو سکتا تھا کہ وہ تو محض ایک چور ہے۔اب انہیں پتہ چل گیا کہ وہ اس قدر حقیر ہے کہ اس سے کسی کو خوفزدہ ہونا ہی نہیں چاہیے۔

باب ہفتم

انقلاب

بادشاہ سوآ نگ تنگ کی حکومت کے تیسرے برس کے نویں ماہ کے چوتھے دن (جس روز آہ کیو نے اپنا بٹوہ چاؤ پائی ین کے ہاتھ فروخت کر دیا) کی آدھی رات کو،تیسرے گھڑیال کے چوتھی گھنٹی پہ ایک بڑی کشتی چاؤ خاندان کے لئے مخصوص جگہ پر لنگر انداز ہوئی۔یہ کشتی گھپ اندھیرے میں آئی جب لوگ گہری نیند سو رہے تھے تاکہ انہیں اس کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہ ہو سکے۔مگر یہ کشتی واپس صبح سویرے لوٹی۔ اس لئے کئی لوگوں نے دیکھ لی۔تحقیقات سے پتہ چلا کہ یہ کشتی دراصل کامیاب کاؤنٹی امیدوار کی تھی۔

اس واقعہ نے وی چوآ نگ میں بڑی بے چینی پھیلا دی،اور دوپہر سے پہلے گاؤں والوں کے دل تیزی سے دھڑکنے لگے۔چاؤ خاندان کشتی کے معمے کے بارے میں بالکل خاموش رہا۔مگر چائے خانے اور شراب کی دکان پہ کھسر پھسر کے مطابق گاؤں میں انقلابی لوگ داخل ہونے والے ہیں اور کامیاب صوبائی امیدوار پناہ لینے گاؤں آیا تھا۔صرف مسز تساؤ نے دوسری طرح سوچا تھا۔اس کا کہنا تھا کہ کامیاب صوبائی امیدوار محض کچھ پرانے مقدمات کو وی چوآ نگ میں رکھنا چاہتا تھا مگر مسٹر چاؤ نے وہ واپس کر دیئے۔دراصل کامیاب صوبائی امیدوار اور چاؤ خاندان والے کامیاب کاؤنٹی امیدوار کے تعلقات اچھے نہ تھے۔اور ان تعلقات میں بہتری کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔

پھر افواہ اڑی کہ سکالر خود نہیں آیا،بلکہ اس نے ایک طویل خط کے ذریعے چاؤ خاندان کے ساتھ اپنی دور کی رشتے داری تلاش کی تھی۔اور چونکہ مسٹر چاؤ نے سوچ بچار کے بعد فیصلہ کیا تھا کہ مقدمات کو اپنے پاس رکھنے سے کوئی نقصان نہیں ہوگا تو انہیں اپنی بیوی کے پلنگ کے نیچے رکھ دیا۔جہاں تک انقلابیوں کی بات تھی،تو کچھ نے کہا کہ وہ اسی رات گاؤں میں داخل ہو چکے تھے۔

آہ کیو بہت عرصے سے انقلابیوں کے بارے میں جانتا تھا۔اور اس سال اپنی آنکھوں سے انقلابیوں کا سر قلم ہوتے ہوئے دیکھا۔لیکن چونکہ اسے لگا کہ انقلابی باغی ہیں اور بغاوت اس کے لئے مشکلات پیدا کرے گی۔اس لئے اس نے ہمیشہ انہیں برا سمجھا اور ان سے دور رہا۔کون اندازہ کر سکتا تھا کہ وہ تیس میل کے علاقے میں ایک مشہور کامیاب کاؤنٹی امیدوار کو خوفزدہ کر سکیں گے؟ نتیجے میں آہ کیوں کو اچھا لگا اور وہ گاؤں والوں کے خوفزدہ ہونے پر بہت خوش ہوا۔

''انقلاب بری چیزی نہیں ہوتی'' آہ کیو نے سوچا۔''ان سب کو ختم کر ڈالو۔۔۔لعنت بھیجو سب پر۔۔۔میں خود انقلابیوں کے ساتھ ہو جاؤنگا''۔

آہ کیو ان دنوں بہت درشت مزاج ہو گیا تھا۔وہ ایک طرح سے غیر مطمئن ہو چکا تھا۔اس پر طرہ یہ کہ ایک روز اس نے دوپہر کو خالی پیٹ دو کٹورے شراب کے بھی چڑھا لئے تھے۔نتیجے میں وہ جلد ہی دھت ہو گیا۔اس نے محسوس کیا کہ جیسے وہ ہوا پر تیر رہا ہو۔اچانک عجب انداز میں اس نے محسوس کیا کہ جیسے وہ خود بھی انقلابی ہو۔اور وی چوآنگ کے سارے لوگ اس کی قید میں ہوں۔وہ اپنی خوشی کے جذبات نہ روک سکا اور زور زور سے نعرے لگانے لگا۔

''بغاوت! بغاوت''

سارے گاؤں والے اسے حیرت سے دیکھنے لگے۔آہ کیو نے اس سے قبل اس قدر قابل ترس نظریں نہیں دیکھی تھیں۔وہ نگاہیں اسے اس قدر فرحت بخش لگیں جیسے سخت گرمیوں میں ٹھنڈا پانی۔چنانچہ وہ مزید مسرت سے نعرے لگاتا ہوا چلنے لگا:

''زبردست۔۔۔میں جو چاہوں اٹھالوں، جسے مرضی پسند کروں!

''لالا،للا، لالا، لالا۔۔۔!

''میں اپنے منہ بولے بھائی چنگ کو غلطی سے قتل کرنے پر پشیمان ہوں۔

''میں قتل کرنے پہ پشیمان ہوں۔۔۔ہا، ہا، ہا!

''لالا،للا، لالا، لا۔۔۔۔۔!

''میں تمہیں فولادی ڈنڈی سے کچل ڈالوں گا''

مسٹر چاؤ اور ان کا بیٹا اپنے دو اور رشتے داروں کے ساتھ گیٹ پہ کھڑے انقلاب کے موضوع پر گفتگو کر رہے تھے۔آہ کیو گردن اکڑائے ''لالا،للا، لا'' گاتے ہوئے گزرا۔مگر اس نے انہیں نہ دیکھا۔

''کیو، پرانے آدمی!'' مسٹر چاؤ نے دھیمی آواز میں کہا۔

''للا'' آہ کیو نے گایا۔اسے اندازہ نہ تھا کہ اس کا نام اس ''پرانے آدمی'' کے ساتھ نتھی کیا جائے گا۔اسے یقین تھا کہ اس نے غلط سنا۔وہ بالکل بے پرواہ لگ رہا تھا۔بس گاتا ہی چلا گیا ''لالا،للا، لالا!''

''کیو، پرانے آدمی!''

''میں۔۔۔۔کے قتل پر پشیمان ہوں۔۔۔''

''آہ کیو!'' کامیاب امیدوار کو اس کا نام لے کر پکارنا پڑا۔

تب کہیں جا کر آہ کیو رک گیا۔''کیا بات ہے؟'' اس نے گردن گھماتے ہوئے پوچھا۔

''کیو، پرانے آدمی۔۔۔۔اب۔۔۔'' مگر مسٹر چاؤ بولتے بولتے رک گیا۔

''کیا تم امیر بن رہے ہو؟''

''امیر؟۔ہاں۔بے شک۔میں جو چاہوں اٹھالوں۔۔۔''

''آہ۔۔۔۔کیو، پرانے آدمی۔تمہارے ہم جیسے بے چارے دوست اب شاید اہمیت ہی نہیں رکھتے۔۔۔۔'' چاؤ پائی ین نے دکھاوا کرتے ہوئے کہا۔گویا وہ انقلابیوں کے رویوں کی شکایت کر رہا ہو۔

''بے چارے دوست؟۔تم تو مجھ سے امیر ہو'' آہ کیو نے جواب دیا اور چل پڑا۔

وہ مایوس اور گم سم کھڑے رہے۔پھر مسٹر چاؤ اور اسکا بیٹا واپس گھر کے اندر چلے گئے اور شام کو اُس وقت تک اس مسئلے پر گفتگو کرتے رہے جب تک کہ چراغ جلانے کا وقت ہو گیا۔جب چاؤ پائی ین گھر گیا تو اس نے اپنی کمر سے بٹوا نکال کر اسے اپنی بیوی کو تھما دیا تا کہ وہ اسے اپنے پاس چھپا دے۔

آہ کیو کچھ دیر تک ہوا میں چلتا رہا مگر مندر پہنچتے پہنچتے حواس میں آ گیا۔اس رات مندر کا بڈھا نگران بھی اس کے ساتھ غیر معمولی دوستانہ انداز میں پیش آیا۔اس نے اسے چائے تک کا پوچھا۔آہ کیو نے اس سے کیک کے دو ٹکڑے مانگے۔انہیں کھانے کے بعد اس نے ایک استعمال شدہ چار اونس والی موم بتی مانگی۔موم بتی جلا کر وہ چھوٹے سے تنہا کمرے میں لیٹ گیا۔وہ نا قابل بیان انداز میں تازہ دم اور مسرور تھا جبکہ موم بتی کی روشنی ''جشنِ لالٹین'' کی طرح لپکتی جگمگاتی تھی۔اور اس کے خیالات اس کے ساتھ ساتھ پرواز کرتے رہے۔

''بغاوت؟ مزہ آئے گا۔۔۔انقلابیوں کا ایک گروہ آئے گا۔ان سب نے سفید ہیلمٹ اور سفید وردیاں پہنی ہونگی۔تلواریں سونتی ہوں گی، فولادی لاٹھیاں، بم، غیر ملکی بندوقیں، تیز نوک والے دو دھاری خنجر اور نیزے اٹھائے ہونگے۔وہ مندر آئیں گے، اور پکاریں گے، 'آہ کیو! ہمارے ساتھ آ جاؤ!' اور پھر میں ان کے ساتھ جاؤنگا۔۔۔

''پھر سارے گاؤں والے مضحکہ خیز بن جائیں گے، گھٹنوں کے بل جھک کر فریادیں کریں گے کہ آہ کیو ہماری جان بچاؤ۔مگر ان کی کون سنے گا۔۔۔سب سے پہلے تو مرے گا یوانگ ڈی اور مسٹر چاؤ، پھر مرے گا کامیاب کاؤنٹی امیدوار اور نقلی غیر ملکی شیطان۔۔۔مگر میں شاید چند ایک کو چھوڑ دوں گا۔ایک وقت تھا جب میں موچھل وانگ کو چھوڑ دیتا مگر اب تو میں اس کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔۔۔

''چیزیں۔۔۔!! میں سیدھا جا کر بکسے کھول دونگا، چاندی کے زیورات، غیر ملکی کرنسی، سونا۔۔۔سب سے پہلے میں کامیاب کاؤنٹی امیدوار کی بیوی کا خوبصورت پلنگ مندر لاؤنگا اور چی این خاندان کی میزیں اور کرسیاں بھی۔۔۔۔اور اسی طرح چاؤ خاندان کی بھی۔میں خود ہاتھ بھی نہیں ہلاؤنگا بلکہ یوانگ ڈی کو حکم دونگا کہ میرے لئے چیزیں اٹھائے، اسے تھپڑ کے زور سے تیزی کے ساتھ یہ کام کرنے ہونگے۔۔۔

''چاؤ سزوچن کی چھوٹی بہن بہت بدصورت ہے۔کچھ ہی سالوں میں مسز تساؤ کی بیٹی شاید توجہ کے لائق بن جائے۔نقلی غیر ملکی شیطان کی بیوی ایک ایسے شخص کے ساتھ سونے پر راضی ہے جس کی

چٹیانہ ہو، ہونہہ۔ وہ اچھی عورت نہیں ہوسکتی۔ کامیاب کاؤنٹی امیدوار کی بیوی کی پتلیوں پر نشانات ہیں۔۔۔۔ میں نے اماہ وو کو بہت عرصے سے نہیں دیکھا۔۔۔ کتنی بری بات ہے۔ اس کے پیراتنے بڑے ہیں''۔

اس سے قبل کہ آہ کیو کسی اطمینان بخش نتیجے پہ پہنچتا خراٹوں کی آوازیں آنے لگیں۔ چار اونس والی موم بتی محض آدھ انچ جل چکی تھی اور اس کی پھڑ پھڑاتی سرخ روشنی اس کے چہرے کو روشن کر رہی تھی۔

''آہ، آہ'' آہ کیو دفعتاً چلّانے لگا۔ اس نے سر اٹھا کر آس پاس دیکھا۔ مگر جب چار اونس والی موم بتی دیکھی تو دوبارہ لیٹ گیا اور سو گیا۔

اگلی صبح وہ بہت دیر سے جاگا اور باہر گلی میں گیا تو ہر چیز حسب معمول تھی۔ اسے بھوک لگ رہی تھی۔ اس نے دماغ پہ بہت زور دیا مگر کچھ نہ سوجھا۔ اچانک ایک بات اس کے دماغ میں آ گئی اور وہ آہستہ آہستہ چلتا رہا۔ شاید سوچ سمجھ کر، یا پھر بلا سوچے وہ خاموش خود اصلاحی کے کانونٹ پہنچا۔

کانونٹ اس موسم بہار میں بہت پرسکون تھا۔ وہی سفید دیوار اور وہی کالا چمکدار گیٹ۔ لمحہ بھر سوچنے کے بعد اس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے ایک کتے نے بھونکنا شروع کیا۔ اس نے جلدی جلدی ٹوٹی ہوئی اینٹوں کے کئی ٹکڑے اٹھائے اور دوبارہ جا کر دروازہ زور زور سے پیٹنے لگا۔ وہ اس وقت تک یہی کچھ کرتا رہا جب تک کہ کالے گیٹ پر بے شمار چھوٹے چھوٹے گڑھے پڑ گئے۔ بالآخر اس نے سنا کہ کوئی گیٹ کھولنے آ رہا ہے۔

آہ کیو اینٹوں کے ٹکڑے ہاتھ میں لئے ٹانگیں پھیلائے کھڑا تھا۔ وہ کالے کتے سے لڑنے کے لئے تیار تھا۔ کالا گیٹ ذرا سا کھلا مگر کوئی کالا کتا بھاگتا ہوا باہر نہ نکلا۔ جب اس نے غور سے دیکھا تو اسے صرف بوڑھی راہبہ نظر آئی۔

''تم پھر کیوں آئے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''تمہیں نہیں معلوم؟۔۔۔۔ انقلاب آ گیا ہے''۔ آہ کیو نے لاتعلق سے انداز میں کہا۔

''انقلاب، انقلاب۔۔۔۔ ایک تو پہلے آ چکا ہے'' بوڑھی راہبہ نے کہا۔ اس کی آنکھیں رونے کی وجہ سے سرخ ہو چکی تھیں۔ ''تمہارا کیا خیال ہے تمہارے سارے انقلابوں سے ہمارا کیا بنے گا؟''۔

''کیا؟'' آہ کیو نے حیرت سے پوچھا۔

''تمہیں نہیں معلوم؟ انقلابی پہلے ہی یہاں آ چکے ہیں!''

''کون؟'' آہ کیو نے مزید حیرانگی سے پوچھا۔

''کامیاب کاؤنٹی امیدوار اور نقلی غیر ملکی شیطان''۔

آہ کیو مکمل طور پر حیران ہوا۔ وہ بالکل بجھ گیا۔ جب بوڑھی راہبہ نے دیکھا کہ اس کی تیزی ختم ہو چکی ہے تو اس نے تیزی سے گیٹ بند کر دیا تا کہ جب آہ کیو اسے دوبارہ دھکیلے تو اسے کھول نہ سکے۔ اور جب اس نے گیٹ دوبارہ کھٹکھٹایا تو کوئی جواب نہ آیا۔

یہ واقعہ اسی صبح ہوا تھا۔ کامیاب امیدوار نے فوراً خبر لگائی اور جونہی اس نے سنا کہ انقلابی اسی رات گاؤں میں داخل ہو گئے تو اس نے فوراً اپنی چوٹی سر کے گرد باندھ لی اور سب سے پہلے چی این خاندان میں نقلی غیر ملکی شیطان سے ملنے چلا گیا جس کے ساتھ اس کے تعلقات کبھی اچھے نہ رہے تھے۔ چونکہ یہ وقت ایسا تھا کہ سب لوگ اصلاحات کے لئے کام کریں اس لئے ان کی ملاقات خوشگوار رہی اور وہ فوراً ساتھی بن گئے اور انقلابی بننے کا عہد کیا۔

کچھ دیر سر کھپانے کے بعد انہیں خیال آیا کہ خاموش خود اصلاح کے کانونٹ میں ایک شاہی میز ہے جس پر ''بادشاہ زندہ باد'' کندہ کیا ہوا ہے۔ اسے فی الفور تباہ کر دینا چاہیے۔ چنانچہ ایک لمحہ ضائع کئے بغیر انہوں نے کانونٹ جا کر اپنی انقلابی کارروائی کی۔ چونکہ بوڑھی راہبہ نے انہیں روکنے کی کوشش کی تھی اور کچھ ایسے الفاظ کہے تھے جس سے انہوں نے اسے چنگ بادشاہ کی حکومت کی طرفدار سمجھا اور ایک چھڑی سے اسے پیٹا۔ جب وہ چلے گئے اور راہبہ کے ہوش بحال ہوئے تو دیکھا کہ شاہی میز مین پر ٹکڑے ٹکڑے کر کے پھینک دی گئی تھی اور رحم کی دیوی کوآن ین کے مقبرے کے سامنے والا جواہرات جڑا ہوا قیمتی برتن غائب تھا جس میں لوبان جلا کر خوشبو پیدا کی جاتی تھی۔

یہ سب کچھ آہ کیو کو بعد میں معلوم ہوا۔ اسے اپنی گہری نیند سو جانے کا افسوس ہوا۔ اسے اس حقیقت پر بہت پشیمانی ہوئی کہ وہ اسے بلانے نہ آئے۔ پھر اس نے خود سے کہا ''ممکن ہے انہیں ابھی تک معلوم نہ ہو کہ میں انقلابیوں میں شامل ہو چکا ہوں''۔

باب ہشتم

انقلاب سے باہر

وی چوآنگ کے لوگ روز بروز مطمئن ہوتے گئے۔ خبروں سے انہیں پتہ چلا کہ گو کہ انقلابی گاؤں میں داخل تو ہوئے مگر ان کے داخل ہونے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔ مجسٹریٹ بدستور بلند ترین افسر تھے، محض عہدے کا نام تبدیل ہوا تھا۔ کامیاب صوبائی امیدوار کو بھی کوئی عہدہ ملا تھا مگر وی چوآنگ گاؤں کے لوگ یہ نام واضح طور پر یاد نہ رکھ سکتے تھے۔ یہ کوئی سرکاری پوسٹ جیسا نام تھا۔ ملٹری کا سربراہ وہی پرانا کیپٹن ہی تھا۔ تشویش کی واحد بات یہ تھی کہ انقلابیوں نے گاؤں میں داخل ہونے کے ایک ہی دن بعد لوگوں کی چٹیائیں کاٹ دی تھیں۔ کہتے ہیں کہ ساتھ کے گاؤں والا کشتی بان ''سات پاؤنڈی'' ان کے ہتھے چڑھ گیا اور اب وہ کسی کو شکل دکھانے کے قابل نہیں رہا ہے۔ لیکن پھر بھی یہ خطرہ اتنا بڑا نہیں تھا اسلئے کہ وی چوآنگ گاؤں کے لوگ شہر جاتے ہی کم تھے اور جن لوگوں نے وہاں چکر لگانے کا منصوبہ بنا رکھا تھا انہوں نے بھی خطرے سے بچنے کی خاطر اپنا ارادہ بدل دیا۔ آہ کیو بھی شہر جانے کا سوچ رہا تھا مگر جونہی اس نے یہ خبر سنی تو اس نے جانے کا خیال ترک کر دیا۔ مگر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وی چوآنگ میں

اصلاحات ہوئیں ہی نہیں۔ اگلے چند دنوں میں چٹیائیں اپنے سروں پر باندھنے والوں کی تعداد بڑھ گئی ،اور جیسا کہ پہلے کہا گیا، سب سے پہلے کاؤنٹی کے کامیاب امیدوار نے ایسا کیا، اس کے بعد چاؤسوچین اور چاؤپی ین تھے اور ان کے بعد آہ کیو۔ اگر یہ موسم گرما ہوتا تو یہ حیرت کی بات نہ ہوتی کہ ہر شخص اپنی چٹیائیں سر پہ لپیٹتا یا انہیں گرہ سے باندھتا۔ مگر یہ تو آخرِ خزاں تھا، اس لئے ان لوگوں کی طرف سے گرمیوں کا کام خزاں میں کرنا یعنی چٹیا کو سر پہ لپیٹنا بہادری والا فیصلہ گردانا جاتا تھا اور جہاں تک وی چو آ نگ کا تعلق ہے تو کہا جاسکتا کہ اس میں اصلاحات نہ ہوئیں۔

جب چاؤسوچین کی گردن پچھلی طرف سے ننگی نظر آئی تو جن لوگوں نے اسے دیکھا تبصرہ کیا، ''ارے وہ دیکھو ایک انقلابی آ رہا ہے!''

جب آہ کیو نے یہ دیکھا تو وہ بہت متاثر ہوا۔ گو کہ اس نے بہت پہلے سنا تھا کہ کاؤنٹی کے کامیاب امیدوار نے چٹیا سر پہ لپیٹ رکھی ہے، مگر اسے خود کبھی یہی کرنے کا خیال نہ آیا۔ مگر اب جبکہ اس نے دیکھا کہ چاؤسوچن نے بھی ایسا کر رکھا ہے تو اسے بھی یہی کرنے کا خیال آتا۔ اس نے ان کی نقل کرنے کا ارادہ کرلیا۔ اس نے اپنی چوٹی کو اپنے سر پر باندھنے کیلئے بانس کی ایک تیلی استعمال کی اور کچھ جھجک کے بعد بالآخر اس نے باہر جانے کی جرات کی۔

جب وہ گلی میں سے جا رہا تھا تو لوگ اس کی طرف دیکھتے تھے مگر بولا کوئی بھی نہیں۔ آہ کیو پہلے تو بہت ناخوش ہوا، پھر وہ بہت پشیمان ہوا۔ حالیہ عرصے میں اسے بہت جلد غصہ آجاتا تھا۔ دراصل اس کی زندگی انقلاب سے قبل مشکل تر نہ تھی، لوگ اس سے نرمی سے پیش آتے تھے، اور دکاندار اس سے نقد ادائیگی کا مطالبہ نہیں کرتے تھے، پھر بھی آہ کیو غیر مطمئن سا تھا۔ اس نے سوچا کہ جب کہ ایک انقلاب برپا ہو چکا ہے ،تو اس میں مزید کچھ شامل ہونا چاہیے۔ جب اس نے یوانگ ڈی کو دیکھا تو اس کا غصہ مزید بڑھ گیا۔

یوانگ ڈی نے بھی اپنی چوٹی اوپر اپنے سر پر لپیٹ رکھی تھی، اور وہ بھی بانس کی ایک تیلی کے ذریعے ایسا کرتا تھا۔ آہ کیو تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ یوانگ ڈی بھی ایسا کرنے کی جرات کرسکے گا۔ وہ ایسی چیز بالکل برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ یوانگ ڈی کون ہوتا ہے؟ اسے یوآ نگ ڈی کی چوٹی نیچے لٹکنے دینے اور کئی بار اس کے چہرے پر بے تحاشا تھپڑ مارنے کی خواہش ہوئی تا کہ اسے اپنا مقام بھولنے اور ایک انقلابی ہونے کے دکھاوے کی سزا دی جاسکے۔ مگر آخر میں اس نے اسے جانے دیا، صرف غضبناک آنکھوں سے گھورا، تھوکا اور ''پاہ'' کہا۔

ان آخری چند دنوں میں شہر جانے والا واحد شخص نقلی غیر ملکی شیطان تھا۔ چاؤ فیملی میں کامیاب کاؤنٹی امیدوار نے کامیاب صوبائی امیدوار سے ملنے کیلئے جمع کردہ مقدمات کو بہانہ بنانے کا سوچا۔ مگر اس نے اس خیال کو اس ڈر کی وجہ سے ترک کردیا کہ کہیں اس کی چوٹی کاٹ نہ دی جائے۔ اس نے ایک بہت ہی فارمل خط لکھا اور نقلی غیر ملکی شیطان سے اسے شہر پہنچانے کو کہا۔ اس نے اسے لبرٹی پارٹی سے

متعارف کرنے کا بھی کہا۔ جب نقلی غیر ملکی شیطان واپس آیا تو اس نے کاؤنٹی امیدوار سے چار ڈالرز کا مطالبہ کیا، جس کے بعد کامیاب کاؤنٹی امیدوار نے اپنے سینے پر ایک چاندی کا بیج لگایا۔ وی چوانگ گاؤں کے سب لوگ مرعوب ہوئے، اور کہا کہ یہ پارٹی کا بیج تھا جو کہ ہان لین کے رینک کے برابر تھا۔ نتیجتاً مسٹر چاؤ کا وقار اچانک بڑھ گیا، اس قدر زیادہ کہ جب پہلے پہل اس کا بیٹا سرکاری امتحان میں پاس ہوگیا تھا تو اس نے ہر دوسرے شخص کو حقیر جاننا شروع کردیا، اور جب اس نے آہ کیو کو دیکھا تو اسے ایک حد تک نظر انداز کرنے کی کوشش کی۔

آہ کیو خود کو مسلسل نظر انداز ہوتے دیکھ کر مکمل طور پر مایوس ہوا مگر جب اس نے اس چاندی کے بیج کا سنا تو یکدم احساس ہوا کہ اسے سردی میں کیوں چھوڑ دیا گیا۔ صرف یہ کہنے سے کوئی انقلابی نہیں بن جاتا کہ تم مخبر بن جاؤ نہ ہی محض یہ کافی تھا کہ اپنی چوٹی سر پر لپیٹ دی جائے۔ سب سے اہم چیز انقلابی پارٹی کے ساتھ رابطہ رکھنا تھا۔ وہ اپنی ساری زندگی میں صرف دو انقلابیوں کو جانتا تھا جن میں سے ایک نے شہر میں اپنا سر گنوا دیا تھا، صرف نقلی غیر ملکی شیطان رہ گیا تھا۔ چنانچہ جب تک کہ وہ فوری طور پر نقلی غیر ملکی شیطان کے پاس نہ جاتا اس کے پاس اور کوئی راستہ نہ تھا۔

چائین ہاؤس کا سامنے والا گیٹ اس وقت کھلا ہوا تھا اور آہ کیو بہت مودبانہ انداز میں گھس گیا ۔اس نے دیکھا کہ نقلی غیر ملکی شیطان احاطے کے درمیان کھڑا ہے۔ اس نے مکمل طور پر سیاہ سوٹ پہن رکھا ہے، جو یقینی طور پر غیر ملکی ہے، اس نے چاندی کا ایک بیج لگا رکھا ہے۔ اور ہاتھ میں ایک چھڑی پکڑی ہوئی تھی جس کی قدر و قیمت سے آہ کیو پہلے ہی واقف تھا۔ ایک فٹ لمبے بال جو اس نے دوبارہ رکھ لئے تھے شانوں پر جھکے پڑے تھے جس طرح کہ حضرت لیو کے بال تھے۔ اس کے سامنے چاؤ پائی ین اور تین دوسرے افراد سیدھے کھڑے تھے۔ وہ سب کے سب نقلی غیر ملکی شیطان کی باتوں کو غور سے سن رہے تھے۔

آہ کیو اندر سجدہ ریز ہوا، اس نے سلام کرنا چاہا، مگر نہیں جانتا تھا کہ کیا کہا جائے۔ ظاہر ہے وہ اس شخص کو نقلی غیر ملکی شیطان نہیں کہہ سکتا تھا، اور نہ ہی ''غیر ملکی'' یا ''انقلابی'' موزوں لگتے تھے۔ شاید اسے مخاطب کرنے کا سب سے اچھا خطاب ''مسٹر غیر ملکی'' ہو۔

مگر مسٹر غیر ملکی نے اسے نہیں دیکھا اس لئے کہ وہ آنکھیں اوپر اٹھائے ہوئے کہہ رہا تھا:

''جب ہم ملے تو میں کہتا رہا، بوڑھے ھانگ! ہمیں یوں کرنا چاہیے، مگر وہ ہمیشہ جواب دیتا ''نائیں''۔ یہ ایک غیر ملکی لفظ ہے جس کے مطلب تم نہیں جانتے ہو۔ وگرنہ ہم بہت عرصہ قبل کامیاب ہو چکے ہوتے۔ یہ ایک مثال ہے کہ وہ کس قدر محتاط ہے۔ اس نے مجھے بار بار ھُوپہہ جانے کا کہا مگر میں راضی نہیں ہو رہا تھا۔ ایک چھوٹے سے گاؤں میں کون کام کرنا چاہے گا؟۔۔۔۔''

''ارر۔رر''۔ آہ کیو نے اس کے وقفے کا انتظار کیا، پھر بولنے کیلئے ہمت یکجا کی مگر وہ پھر اسے مسٹر غیر ملکی نہ پکار سکا۔

چار آدمی جو اسے سن رہے تھے روانہ ہونے لگے اور مڑ کر آہ کیو کو دیکھنے لگے۔ مسٹر غیر ملکی نے بھی اسے دیکھا۔

''کیا ہے؟''

''میں۔۔۔''

''بول دو''

''میں شامل ہونا چاہتا ہوں۔۔۔۔''

''نکل جاؤ باہر'' مسٹر غیر ملکی نے چھڑی بلند کرتے ہوئے کہا۔

پھر چاؤ پائی ین اور دوسرے چلّائے۔ ''مسٹر چائین تمہیں باہر نکل جانے کا کہہ رہے ہیں، سنتے نہیں!''۔

آہ کیو نے سر بچانے کے لئے اپنے ہاتھ سر پر رکھے اور یہ جانے بغیر کہ کیا کر رہا ہے گیٹ کی طرف بھاگا۔ مگر اس بار مسٹر غیر ملکی اس کے پیچھے دوڑا نہیں۔ ساٹھ قدم سے زیادہ بھاگنے کے بعد آہ کیو نے قدم آہستہ کر دیئے اور بہت شرمندگی محسوس کی۔ اس لئے کہ اگر مسٹر غیر ملکی اسے انقلابی بننے نہیں دیں گے تو اس کے لئے اور کوئی راستہ نہ تھا۔ مستقبل میں اسے بلانے کیلئے کوئی سفید ہیلمٹ اور سفید وردی پہنے ہوئے لوگ نہیں آئیں گے۔ اس کا سارا شوق، مقاصد، امید اور مستقبل ایک ہی جنبش سے تباہ کر دیئے گئے تھے۔ یہ تو مزید سُبکی کی بات تھی کہ لوگ اس خبر کو پھیلائیں گے اور یو انگ ڈی اور موچھل وانگ جیسے لوگ اس پر ٹھٹھے مارتے رہیں گے۔

اس نے خود کو اس قدر ذلیل کبھی نہیں محسوس کیا تھا۔ حتیٰ کہ اپنی چوٹی سر پر لپیٹنا بھی اب اسے بے کار اور مضحکہ خیز لگا۔ انتقام کے بطور اسے فوراً چوٹی نیچے گرانے کا خیال آیا مگر اس نے ایسا کیا نہیں۔ وہ شام تک آوارہ پھرتا رہا۔ جب اس نے قرض پر شراب کے دو کٹورے پیئے تب اس کی طبیعت کچھ بحال ہوئی۔ اس نے دوبارہ اپنے دماغ کی آنکھ سے سفید ہیلمٹوں اور سفید وردی کے نامکمل مناظر دیکھے۔

ایک دن وہ رات گئے تک آوارہ گردی کرتا رہا اور جب شراب کی دکان بند ہونے لگی تو وہ مندر لوٹا۔

''ٹھاک، ٹھاک!'' اس نے اچانک غیر معمولی آواز سنی۔ آہ کیو کو دوسروں کے معاملات میں ٹانگ اڑانے کا ہمیشہ سے شوق رہا تھا۔ وہ اندھیرے میں آواز کی طرف روانہ ہوا۔ اس نے قدموں کی آہٹ سنی۔ وہ غور سے سن رہا تھا جب اس نے اپنے سامنے سے ایک آدمی کو تیز بھاگتے دیکھا۔ جونہی آہ کیو نے اسے دیکھا تو اس کا پیچھا کرنا شروع کر دیا۔ جس تیزی سے ممکن تھا وہ دوڑنے لگا۔ جب وہ شخص مڑا تو آہ کیو بھی مڑا اور جب ایک موڑ مڑ کر وہ شخص رکا تو آہ کیو بھی رک گیا۔ اس نے دیکھا کہ پیچھے کوئی نہیں اور وہ آدمی یو انگ ڈی تھا۔

''کیا معاملہ ہے؟'' آہ کیو نے تحقیر سے پوچھا۔

''چاؤ۔۔۔ چاؤ فیملی کو لوٹ لیا گیا'' یو انگ ڈی نے ہانپتے ہوئے کہا۔

آہ کیو کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ یہ بتا کر یو انگ ڈی چلا گیا۔ آہ کیو دوڑنے لگا پھر دو تین بار رکا۔ البتہ چونکہ وہ کبھی خود اس دھندے میں رہا تھا اس لئے غیر معمولی بہادری محسوس کرنے لگا۔ گلی کے نکڑ سے نکل کر اس نے غور سے سنا اور اسے لگا کہ اسے چیخنے کی آواز سنائی دی۔ اس نے غور سے دیکھنا شروع کیا اور اسے لگا کہ کئی آدمی سفید ہیلمٹوں اور سفید وردیوں میں نظر آئے جو کہ الماریاں لے جا رہے تھے، فرنیچر لے جا رہے تھے حتیٰ کہ کامیاب کاؤنٹی امیدوار کی بیوی کا پلنگ بھی لے جا رہے تھے۔ البتہ وہ انہیں واضح طور نہیں دیکھ پا رہا تھا۔ اس نے نزدیک جانا چاہا مگر اس کے پیر گویا زمین سے جکڑ گئے تھے۔

اس رات چاندنی تھی اور وی چوآنگ گھپ اندھیرے میں بہت خاموش تھا، اس قدر کہ قدیم بادشاہ فوہسی کے زمانے میں ہوا کرتا تھا۔ آہ کیو اس وقت تک وہاں کھڑا رہا جب تک کہ اس کی دلچسپی ختم نہ ہوئی۔ ہر چیز حسب سابق لگ رہی تھی۔ دو رلوگ آ جا رہے تھے، چیزیں اٹھائے الماریاں اٹھائے، فرنیچر اٹھائے، اور کامیاب کاؤنٹی امیدوار کا پلنگ اٹھائے ہوئے۔۔۔ حتیٰ کہ ایسی چیز اٹھائے ہوئے جس پہ وہ یقین نہیں کر سکتا تھا۔ مگر اس نے نزدیک نہ جانے کا فیصلہ کیا اور واپس مندر چلا گیا۔

مندر مزید تاریک تھا۔ جب اس نے بڑا گیٹ بند کر دیا تو اپنے کمرے کی راہ لی اور لیٹے ہوئے کچھ ہی لمحے گزرنے کے بعد وہ سوچنے لگا کہ اس واقعے کے اس پر کیا اثرات پڑیں گے۔ بلاشبہ سفید ہیلمٹوں اور سفید وردیوں والے آدمی پہنچ گئے تھے مگر وہاں اسے بلانے نہیں آئے، وہ بہت ساری چیزیں لے گئے مگر ان میں سے اس کا حصہ نہ تھا۔ یہ سارا قصور نقلی غیر ملکی شیطان کا تھا جس نے اسکے باغی بننے پر پابندی لگا دی تھی۔ ورنہ اسے حصہ ملنے میں اس بار نا کامی کیسے ہو سکتی تھی۔

آہ کیو اس بارے میں جتنا سوچتا اسے اتنا زیادہ غصہ آتا حتیٰ کہ وہ غضبناک ہو گیا ''اچھا، میرے لئے کوئی بغاوت نہیں، صرف تمہارے لئے ہے، ہاں؟''

اس نے کہا اور بدنیتی سے سر ہلانے لگا: ''جہنم میں جاؤ، تم نقلی غیر ملکی شیطان۔۔۔ ٹھیک ہے، باغی ہو جاؤ! باغی کو سر قلم کر کے سزا دی جاتی ہے۔ میں مخبر بن جاؤنگا اور تمہیں تمہارا سر قلم کروانے شہر جاتے ہوئے دیکھوں گا۔۔۔ تم اور تمہارا خاندان۔۔۔ مار ڈالو، مار ڈالو!!''----------

ہان لین:۔ چنگ دورِ سلطنت میں تعلیم کی اعلیٰ ترین ڈگری۔

حضرت لیو:۔ چینی فوک میں ایک لافانی بزرگ جسے ہمیشہ کھلے بالوں میں دکھایا جاتا تھا۔

فوہسی:۔ چین میں ایک قدیم ترین بادشاہ۔

باب نہم

عظیم الشان اختتام

چاؤ خاندان لٹ گیا تو وی چوآنگ میں لوگ خوش بھی ہوئے اور خوفزدہ بھی۔ آہ کیو بھی یہی

کچھ محسوس کر رہا تھا۔ مگر چار دن بعد آدھی رات کو اچانک آہ کیو کو قصبہ بھر میں گھسیٹا گیا۔ فوجی سپاہیوں کا ایک سکواڈ، ملیشیا کا ایک دستہ، پولیس کی ایک پارٹی اور خفیہ کے پانچ افراد خاموشی سے وی چوآنگ میں داخل ہو گئے۔ انہوں نے گیٹ کے بالمقابل ایک مشین گن بردار کھڑا کر کے تاریکی میں مندر کو گھیرے میں لے لیا۔ آہ کیو فرار نہیں ہوا۔ بہت دیر تک مندر میں سے کوئی آواز نہ آئی۔ کیپٹن بے چین ہوا اور بیس ہزار نقد کے انعام کا اعلان کر دیا۔ تب کہیں دو ملیشیا والوں نے دیوار پھاند کر اندر جانے کی جرات کی۔ انہی دو سپاہیوں کی اندرونی مدد کی بدولت باقی سپاہی بھی تیزی سے اندر گئے اور آہ کیو کو باہر کھینچ نکالا۔ اسے مندر کے احاطے سے باہر مشین گن والے کے پاس لے جایا گیا۔ اس دوران وہ اپنے حواس پہ قابو پانے کے قابل ہو گیا تھا۔

دوپہر کے وقت وہ شہر پہنچے اور آہ کیو نے خود کو ایک افسر کی خستہ حال سرکاری قیام گاہ کے طرف لے جاتے ہوئے پایا۔ جہاں اسے ایک چھوٹے سے کمرے میں دھکیل دیا گیا۔ جونہی وہ لڑکھڑاتا ہوا اندر داخل ہوا تو لکڑی کے تختوں والا دروازہ بند ہو گیا۔ جب اس نے اردگرد نظر دوڑائی تو اسے کمرے کے ایک کونے میں دو اور آدمی بھی نظر آئے۔

گو کہ آہ کیو بے چینی سی محسوس کر رہا تھا مگر وہ کسی بھی طرح افسردہ نہ تھا اسلئے کہ وہ مندر میں جس کمرے میں سوتا تھا وہ کسی صورت اس کمرے سے اچھا نہ تھا۔ دونوں دوسرے آدمی بھی دیہاتی لگ رہے تھے۔ انہوں نے آہستہ آہستہ اس سے باتیں کرنا شروع کر دیں۔ ان میں سے ایک نے اسے بتایا کہ کامیاب صوبائی امیدوار اس سے اس کے دادا کے ذمے واجب الادا کرایہ کا تقاضا کر رہا تھا۔ دوسرے کو پتہ ہی نہ تھا کہ وہ کیوں وہاں لایا گیا تھا۔ جب انہوں نے آہ کیو سے پوچھا تو اس نے برجستہ کہا ''اس لئے کہ میں بغاوت کرنا چاہتا تھا''۔

اس سہ پہر کو اسے تختوں والے دروازے سے گھسیٹ کر ایک بڑے ہال میں لے جایا گیا جس کے دوسرے سرے پر ٹنڈ کئے ہوئے سر والا ایک بوڑھا آدمی بیٹھا تھا۔ آہ کیو نے پہلے تو اسے بھکشو سمجھا لیکن جب کھڑے ہوئے مسلح محافظ دیکھے اور اسے آس پاس درجن بھر لمبے کوٹوں والے آدمی دیکھے جن میں سے کچھ کے سر بوڑھے کی طرح کلین شیو کئے ہوئے تھے اور کچھ نے ایک فٹ جتنے لمبے بال رکھے ہوئے تھے جو نقلی غیر ملکی شیطان کی طرح ان کے کندھوں تک لٹک رہے تھے اور سب درشت چہروں کے ساتھ غصے سے اس کی طرف گھور رہے تھے تو اسے اندازہ ہوا کہ وہ شخص یقیناً کوئی اہم آدمی ہوگا۔ اسکے گھٹنے کے جوڑ خود بخود اپنی جبلت کے مطابق ڈھیلے پڑ گئے اور وہ نیچے جھک گیا۔

''کھڑے ہو کر بات کرو، جھکو مت''۔ لمبے کوٹوں والے سارے لوگ چلاّئے۔

گو کہ آہ کیو سمجھ گیا مگر اسے محسوس ہوا کہ وہ اُٹھ نہیں پا رہا۔ اس کا جسم غیر ارادی طور پر ایک دوزانو حالت میں گر گیا۔ اور اسے بہتر بناتے بناتے وہ اور بھی جھک گیا تھا۔

''غلام!'' لمبے کوٹوں والے آدمی حقارت سے بولے۔ البتہ انہوں نے اس کے کھڑے ہو جانے کے لئے اصرار نہیں کیا۔

''سچ بتاؤ، تمہیں نرم سزا دی جائے گی''۔

ٹنڈ والے بوڑھے آدمی نے نچلی مگر واضح آواز میں کہا۔ اس کی آنکھیں آہ کیو پر مرکوز تھیں۔

''مجھے ہر بات پہلے ہی سے معلوم ہے۔ مگر جب تم اعتراف کرو گے تو میں تمہیں جانے دونگا''۔

''اعتراف کر لو!'' لمبے کوٹوں والے آدمیوں نے زور سے دھرایا۔

ایک لمحے کو ہکا بکا ہو کر سوچنے کے بعد ''اس حقیقت کا کہ میں چاہتا تھا۔۔۔ کہ آؤں۔۔۔۔'' آہ کیو بڑبڑایا

''تب تم کیوں نہ آئے؟'' بوڑھے شخص نے نرمی سے کہا۔

''نقلی غیر ملکی شیطان نے مجھے نہیں چھوڑا''

''بکواس۔ اب بہت دیر ہو چکی۔ تمہارے ساتھی کہاں ہیں؟''

''کیا؟۔۔۔۔۔''

''وہ لوگ جنہوں نے اس رات چاؤ خاندان کو لوٹا تھا۔''

''وہ مجھے بلانے نہیں آئے۔ وہ خود سے چیزیں اٹھا لے گئے''۔ اس ذکر نے آہ کیو کو غصہ دلایا۔

''وہ گئے کہاں؟ جب تم بتاؤ گے تو میں تمہیں چھوڑونگا''۔ بوڑھے آدمی نے مزید شائستگی سے کہا۔

''میں نہیں جانتا۔۔۔ وہ مجھے بلانے نہیں آئے تھے''۔

پھر بوڑھے کے اشارے پر آہ کیو کو دوبارہ تختوں والے دروازے کے اندر گھسیٹ کر لے جایا گیا۔ اگلی صبح اسے پھر باہر گھسیٹ کر لایا گیا۔

بڑے ہال میں کچھ بھی نہ بدلا تھا۔ بوڑھا آدمی ٹنڈ سر کے ساتھ ابھی بھی وہیں بیٹھا تھا اور آہ کیو پہلے کی طرح گھٹنوں کے بل جھکا ہوا تھا۔

''کیا بولنے کو تمہارے پاس کچھ اور ہے؟'' بوڑھے شخص نے آہستگی سے پوچھا۔

آہ کیو نے سوچا اور فیصلہ کر لیا کہ اس کے پاس کہنے کو کچھ اور نہیں ہے۔ چنانچہ اس نے جواب دیا ''نہیں''۔

لمبے کوٹ والا ایک شخص ایک کاغذ لایا اور آہ کیو کے سامنے رکھ کر اسے قلم دیا جو وہ اس کے ہاتھ میں پکڑانا چاہتا تھا۔ آہ کیو اس کی عقلمندی سے قریب قریب خوفزدہ تھا اس لئے کہ اس کی زندگی میں پہلی اس کا ہاتھ پہلی مرتبہ قلم کے ساتھ رابطے میں آیا۔ وہ حیران تھا کہ اسے کیسے پکڑا جاتا ہے۔ اس آدمی نے کاغذ کے ایک کونے پر اشارہ کرتے ہوئے اسے اپنا نام لکھنے کو کہا۔

''میں۔۔۔۔ میں۔۔۔۔ لکھ نہیں سکتا''۔ آہ کیو نے شرمندگی کے ساتھ جواب دیا۔

''اس صورت میں، اپنی آسانی کی خاطر ایک دائرہ بنا دو!''

آہ کیو نے ایک دائرہ بنانے کی کوشش کی مگر قلم اٹھانے والا ہاتھ سخت کانپ رہا تھا۔ اس لئے اس شخص نے کاغذ اس کے سامنے زمین پر پھیلا دیا۔ آہ کیو نیچے جھکا اور اس قدر احتیاط کے ساتھ دائرہ لگایا جیسے اس کی زندگی کا انحصار اس پر ہو۔ اس خوف سے کہ کہیں لوگ اس پر نہ ہنسیں، اس نے دائرہ گول بنانے کی کوشش کی لیکن وہ بد بخت قلم بھاری تھا۔ وہ اِس طرف سے اُس طرف پلٹ جاتا تھا اور جب گولائی بند ہونے والی تھی تو قلم پھر لچک کھا گیا اور تربوز کے بیج کی طرح کا دائرہ بن گیا۔

آہ کیو شرمندہ تھا کہ اس سے دائرہ گول نہ ہو سکا۔ وہ شخص بغیر تبصرے کے کاغذ اور قلم کب کا لے جا چکا تھا۔ سپاہیوں نے اسے تیسری بار واپس دروازے میں گھسیٹ لیا۔

اس بار وہ کچھ زیادہ غصے میں نہ تھا۔ اس نے فرض کر لیا کہ اس دنیا میں ہر شخص کی قسمت میں تھا کہ اسے کبھی نہ کبھی جیل کے اندر باہر لایا جائے اور اس سے ایک کاغذ پر دائرہ بنوایا جائے۔ مگر یہ بات اسے اپنی شان میں داغ سی لگی کہ وہ دائرہ گول نہ بنا سکا تھا۔ اب کہیں جا کر یہ سوچ کے اسے قرار سا آیا کہ ''گول دائرہ تو احمق ہی بنا سکتے ہیں'' اور اس سوچ کے ساتھ ہی اسے نیند آ گئی۔

اس رات البتہ کامیاب کاؤنٹی امیدوار سو نہ سکا اس لئے کہ وہ کیپٹن کے ساتھ لڑ پڑا تھا۔ کامیاب کاؤنٹی امیدوار نے اصرار کیا تھا کہ سب سے اہم کام چوری شدہ سامان کی برآمدگی تھی۔ جبکہ کیپٹن نے کہا کہ سب سے اہم کام عبرت کا نشان بنانے کا تھا۔ اس نے میز پہ مکہ مارتے ہوئے کہا ''ایک کو سزا دے دو، سو کو خوفزدہ کر دو! اب دیکھو نا میں انقلابی پارٹی کا بیس سے بھی کم دنوں سے ممبر ہوں مگر درجن بھر ڈاکے پڑ چکے ہیں، ایک بھی ابھی تک حل نہیں ہوا۔ مجھے بہت برا لگتا ہے۔ اب جبکہ یہ واقعہ حل ہو گیا تو تم اپنی علمیت جتانے کی خاطر بحث کرنے آ گئے ہو۔ میں نہیں کرتا۔ یہ میرا کام ہے''۔

کامیاب کاؤنٹی امیدوار کی طبیعت بہت خراب ہوئی مگر وہ اصرار کرتا رہا۔ اس نے کہا کہ اگر سامان برآمد نہ ہوا تو وہ اسسٹنٹ سول ایڈمنسٹریٹر کے عہدے سے فوراً استعفیٰ دے گا۔ کیپٹن نے کہا ''جو مرضی کرو''۔

اس لئے کامیاب علاقائی امیدوار اس رات سو نہیں سکا۔ البتہ اگلی صبح اس نے استعفیٰ نہ دیا۔

تیسری بار جب آہ کیو کو دروازے کے باہر گھسیٹا گیا تو یہ وہی صبح تھی جس کی رات کامیاب کاؤنٹی امیدوار سو نہ سکا تھا۔ جب وہ بڑے کمرے پہنچا تو ٹنڈ کئے ہوئے سر والا شخص حسب معمول وہیں بیٹھا تھا اور آہ کیو بھی ہمیشہ کی طرح اس کے سامنے جھکا۔

بوڑھے آدمی نے بہت نرمی سے پوچھا: ''کیا تم نے اور کچھ کہنا ہے؟''

آہ کیو فیصلہ کر چکا تھا کہ کہنے کو کچھ نہیں اس لئے جواب دیا: ''نہیں''۔

لمبے کوٹوں اور چھوٹی جیکٹوں والے کئی آدمیوں نے اسے غیر ملکی کپڑے کا ایک سفید بنیان پہنایا۔ اس پر کوئی سیاہ تحریر بھی تھی۔ آہ کیو لاتعلق تھا اس لئے کہ یہ ماتمی لباس جیسا تھا اور ماتمی لباس پہننا بد قسمتی تھی۔ اسی دوران اس کے ہاتھ پشت پر باندھ دیئے گئے اور اسے عمارت سے باہر گھسیٹا گیا۔

آہ کیو کو ایک چھکڑے پر بٹھایا گیا اور چھوٹی جیکٹوں والے آدمی اس کے ساتھ بیٹھ گئے۔ ریڑھی یک دم روانہ ہو گئی۔ سامنے غیر ملکی ساخت کی بندوقیں لئے کئی سپاہی کھڑے تھے اور دونوں طرف تماشائیوں کی قطاریں تھیں۔ پیچھے کیا تھا، آہ کیو تو دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اچانک اسے خیال آیا: ''ایسا تو نہیں کہ وہ میرا سر قلم کرنے لے جا رہے ہیں؟'' اس پر دہشت طاری ہو گئی اور اس کی نظروں کے سامنے ہر چیز تاریک ہو گئی۔ اس کے کان بجنے لگے جیسے وہ بے ہوش ہو گیا ہو، مگر وہ بے ہوش ہوا نہیں۔ وہ کچھ وقت تک خوفزدہ رہا لیکن بقیہ وقت پرسکون رہا۔ اسے لگا کہ اس دنیا میں غالباً ہر شخص کی قسمت میں کسی نہ کسی وقت سر قلم ہو جانا لکھا تھا۔

وہ ابھی تک سڑک کو پہچان پا رہا تھا اور کسی قدر حیران ہو رہا تھا: ''وہ لوگ پھانسی کے میدان کی طرف کیوں نہیں جا رہے؟'' اسے معلوم نہ تھا کہ اسے گلیوں میں لوگوں کے لئے عبرت کے بطور پھرایا جا رہا ہے۔ لیکن اگر اسے معلوم ہو بھی جاتا تو بھی بات یہی ہوتی۔ وہ یہی سوچتا کہ اس دنیا میں ہر ایک کی قسمت میں ہے کہ ایک دن عبرت کا نشان بن جائے۔

پھر اسے اندازہ ہوا کہ وہ اسے پھانسی کے میدان لے جانے کے لئے لمبے چکر کاٹ رہے ہیں۔ اس طرح بہر حال اس کا سر قلم کر دیا جائیگا۔ اس نے اپنے پیچھے چیونٹیوں کی طرح رینگتے ہوئے ہجوم کو حسرت سے دیکھا اور غیر متوقع طور پر ان لوگوں میں اس کی نظر آماہ وو پر پڑی۔ ''تو یہ وجہ ہے کہ اس نے اس کا چہرہ اتنے عرصے سے نہیں دیکھا تھا، وہ شہر میں کام کر رہی تھی''۔

آہ کیو دفعتاً خود میں زندہ دلی کی کمی پہ شرمسار ہوا اس لئے کہ وہ کسی گیت میں سے ایک مصرع بھی گا نہ سکا تھا۔

''نوجوان بیوہ اپنے شوہر کی قبر پر'' کچھ زیادہ بہادرانہ تھا۔ ''اژدھے اور شیر کی جنگ'' والے الفاظ زیادہ ہی کمزور تھے۔ ''میں تمہیں فولاد کے ایک ڈنڈے سے پیٹوں گا'' ابھی تک بہترین تھا۔ مگر جب اس نے ہاتھ اٹھانے چاہے تو اسے یاد آیا کہ وہ تو بندھے ہوئے ہیں۔ چنانچہ وہ ''میں تمہیں پیٹونگا'' بھی نہ گا سکا۔

"بیس برس میں ایک اور بن جائونگا" ۔۔۔۔۔ اپنی ہیجانی کیفیت میں آہ کیو نے ایک ضرب المثل کا آدھا بول بول دیا۔ مجمعے کی غراہٹ ''اچھا'' شیر کی دھاڑ کی طرح لگ رہی تھی۔

چھکڑا مستقل آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ چیخوں کے دوران آہ کیو کی آنکھیں آماہ وو کی تلاش میں تھیں۔ مگر لگتا تھا اس نے آہ کیو کو نہیں دیکھا تھا اس لئے کہ وہ غور سے ان غیر ملکی بندوقوں کو دیکھ رہی تھی جو سپاہیوں نے اٹھا رکھی تھیں۔

اس لئے آہ کیو نے نعرے لگاتے مجمعے کو دوبارہ دیکھا۔

اس لمحے اس کی سوچیں پھر گھومنے لگیں۔ چار برس قبل پہاڑ کے دامن میں اس کا سامنا ایک بھوکے بھیڑیا سے ہوا تھا جو ایک متعین فاصلے پر اس کا پیچھا کرتا رہا تھا کہ اسے کھا ڈالے۔ وہ خوف سے تقریباً مر ہی گیا تھا مگر خوش قسمتی سے اس کے ہاتھ میں کلہاڑی تھی جس نے اسے واپس وی چوآنگ جانے

کا حوصلہ بخشا۔ اسے اس بھیڑیے کی آنکھیں کبھی نہ بھولیں، جو وحشی مگر بزدلانہ تھیں، اور اس طرح چمک رہی تھیں جیسے کہ فاصلے سے اس کے اندر سوراخ کرتی جاتی تھیں۔۔۔ اب اسے لوگوں کی آنکھیں بھیڑیا کی آنکھوں سے بھی زیادہ وحشتناک لگ رہی تھیں: بے تاثر مگر چبھتی ہوئی آنکھیں، جو اس کے الفاظ سننے کے بعد اس کے گوشت اور خون کو ہڑپ کرنے پہ بے تاب تھیں۔ اور یہ آنکھیں ایک متعین فاصلے سے اس کا پیچھا کر رہی تھیں۔

یہ آنکھیں مدغم ہو کر ایک بن چکی تھیں، اس کی روح کو کاٹ کھا رہی تھیں۔

''مدد، مدد''۔

مگر آہ کیو نے یہ الفاظ کہے نہیں۔ اس کی آنکھوں کے سامنے سب کچھ تاریک ہو چکا، اس کے کان بج رہے تھے اور اسے لگا جیسے اسکا سارا وجود باریک ریت کی طرح بکھر چکا ہو۔

جہاں تک ڈاکے کے اثرات کا تعلق تھا، سب سے زیادہ اثر کامیاب کاؤنٹی امیدوار پر پڑا، اس لئے کہ چوری کا سامان کبھی بھی برآمد نہ ہوا۔ اس کا سارا خاندان تلخی میں مبتلا تھا۔ اس کے بعد چاؤ کے گھرانے کی بدقسمتی کی باری تھی اس لئے کہ جب کامیاب کاؤنٹی امیدوار ڈاکے کی رپورٹ کرنے شہر چلا گیا تو نہ صرف برے انقلابیوں کی طرف سے اس کی چٹیا کاٹ دی گئی تھی بلکہ اسے مول تول کر کے 20 ہزار نقد ادا کرنا پڑے۔ اس لئے سارا چاؤ خاندان مصیبت میں مبتلا تھا۔

جہاں تک اس واقعے پر کسی بحث کا تعلق ہے تو وی چوآنگ میں کوئی سوال نہیں اٹھایا گیا۔ فطری طور پر سب مانتے تھے کہ آہ کیو ایک برا آدمی رہا تھا۔ ثبوت یہ تھا کہ اسے گولی مار دی گئی تھی۔ اس لئے کہ اگر وہ برا آدمی نہ ہوتا تو اسے گولی کیسے ماری جاتی؟ مگر شہر میں رائے عامہ مطمئن نہ تھی۔ لوگوں کی اکثریت غیر مطمئن تھی۔ اس لئے کہ گولی مار دینا اتنا اچھا تماشا نہ تھا، جتنا کہ سر قلم کرنا تھا۔ اور وہ کس قدر مضحکہ خیز مجرم تھا کہ اتنی گلیوں میں پھرائے جانے کے باوجود کسی گیت سے ایک مصرع بھی گا نہ سکا تھا۔ وہ بیکار اس کا پیچھا کرتے رہے تھے۔

☆☆☆☆☆☆

''بیس برس میں دوبارہ ایک کڑیل جوان آدمی ہونگا'' ایک ایسا جملہ تھا جو پھانسی سے قبل مجرم اکثر استعمال کرتے تھے یہ دکھانے کے لئے کہ وہ موت سے نفرت کرتے ہیں۔

(8 دسمبر 1921)

☆☆☆

اخلاق انصاری/ سندھی سے ترجمہ ننگر چنا

میں کائنات ہوں

صحن میں اُگے ہوئے توت کے درخت نے آگے بڑھ کر اپنی ٹہنیوں کو کاریڈور میں لا پھینکا ہے اور باہر اس کی شاخوں پر کوئل اور کستورہ بیٹھے ہوئے ہیں۔ شاید دوسرے پرندے بھی بیٹھتے ہوں گے؟ شاخیں اس کے باپ کی میراث تو نہیں ہیں، لیکن دیکھتا تو آج ہی ہوں نا۔ درخت بھی بڑے کامریڈ ہیں، یہ بالکل نہیں سوچتے کہ جو توت کھائے گی وہ کوئل ہے یا بلبل۔ توت کا درخت اتنا بڑا کامریڈ بھی نہیں کہ نجی ملکیت کے خلاف بات کا بتنگڑ بنائے، تقریر بازی کرے۔

بات کا بتنگڑ تو میں بھی بناتا ہوں۔ میں کم از کم اپنی بیوی کو تو قومی ملکیت بننے نہیں دوں گا۔ کل کو پھر کہیں گے، 'نجی ملکیت بھی مت رکھو' اور نہ ہی میں اتنا امیر ہوں کہ دو پیگ چڑھا کر key club چلا جاؤں گا۔

میں؟

میں تو بستر پر پڑا ہوا ہوں۔ میری دونوں ٹانگوں اور ایک بازو پر پلاسٹر چڑھا ہوا ہے۔ کوئی مجھے بتائے کہ میں کہاں ہوں؟

کبھی دیکھتا ہوں کہ ڈاکٹروں کے ہاتھوں میں ایکسریز ہیں اور نرسوں کے ہاتھوں میں کاغذ۔ وہ آپس میں کچھ گفتگو کر کے، کچھ کانا پھوسی کرتے ہوئے سازش کر جاتے ہیں۔ دوسرے تمام مریضوں کے ساتھ ایک انجکشن مجھے بھی لگا جاتے ہیں۔ آپ زیادہ پریشان نہ ہوں۔۔۔ میں شاید ہسپتال میں ہوں! انجکشن لگتے ہی ایک قسم کا سرور سا آ جاتا ہے۔ پتہ نہیں کتنی رنگین تصاویر بنتی اور بگڑتی ہیں، مجھ سے باتیں کرتی ہیں۔ میں انہیں جواب دیتا ہوں تو ہنستی ہیں۔ جب وہ ہنستی ہیں تو پھر مجھے بھی ہنسنا چاہیے۔ میں ہنستا ہوں تو دوسرے بستروں والے غصہ کرتے ہیں۔ وہ مجھ سے بیزار ہیں۔

ہوتے ہیں تو ہونے دو۔ میں نے سسٹر سے شکایت کی۔ اس نے مجھے کاغذ اور قلم دیے اور کہا، وہ تصویریں بناؤ اور جو باتیں کرتی ہیں وہ اس کاغذ پہ لکھو۔

کیا لکھوں؟

خط لکھتا ہوں!

پیاری چڑیا۔۔۔! تم چوں چوں مت کرو، میرے سر پہ ہتھوڑے برس رہے ہیں۔۔۔ ارے! مڑ کو تو دیکھو! وہ میرے قلم پر چڑھ کر، دائیں بازو پر ٹہلتی ہوئی، میرے کان میں گھس گئی ہے۔۔۔ ماں! اے

ماں!!۔۔۔تم چڑیا تو نہیں ہو۔۔۔تُو میرے کان میں مت جا۔۔۔میرے قریب بیٹھ کر مجھے کہانیاں سنا۔۔۔تم تو ایک مرتبہ آئی تھیں۔۔۔کہانی سُنا رہی ہو۔۔۔ایک تھا بادشاہ۔۔۔نہیں نہیں۔۔۔مجھے بادشاہ اچھے نہیں لگتے۔۔۔بھلا میں کہانی سناؤں۔۔۔لوگ بڑے کمینے ہیں، میں کہانی سناتا ہوں۔۔۔ دیکھو تو سب سن رہے ہیں۔وہ بیڈ نمبر پانچ والا رات میرے ساتھ ریپ کر گیا۔اس کی تو۔۔۔ماں! بہنیں میرے پاس کیوں نہیں آئی ہیں؟۔۔۔ارے! جسے میں نے گالیاں دیں وہ تو تین دن قبل مر گیا تھا۔۔۔ مرے ہوئے آدمی کو گالیاں نہیں دی جاتیں۔۔۔مجھے سسٹر اچھی لگتی ہے۔وہ ہنستی ہے۔وہ مجھے رفع حاجت کروانے کے لیے لے جاتی ہے۔۔۔رفع حاجت کرتے ہوئے پیسے نکلتے ہیں۔وہ کہہ رہی تھی کہ جب تم گھر جاؤ گے، تب تمام پیسے اکٹھے کر کے دے دوں گی۔۔۔اور سسٹر کراس بناتی ہے۔۔۔لیکن میرے آنکھیں بند ہیں۔اب میں بند آنکھوں سے بھی دیکھتا ہوں۔۔۔لنگڑا پٹھان مر گیا۔۔۔اچھا ہوا جو مر گیا، ورنہ اگر نہ مرتا تو اپنی بیساکھی میرے سر پہ دے مارتا۔

دھوپ کھڑکی سے گذر کر سرخ کمبل پر آ گری ہے۔۔۔کمبل رو رہا ہے۔۔۔شاید رات دوسرا کمبل بھی مر گیا۔سسٹر مجھے اچھی نہیں لگتی۔اس نے کراس نہیں بنایا۔۔۔کیوں نہیں بنایا؟۔۔۔موت بھی کراس ہے۔نہیں۔۔۔وہ آئے تو اس کے سر پہ گلاس پھوڑتا ہوں۔وہ مر جائے گی تو میں کراس بناؤں گا۔

آج نہیں، کل۔۔۔نہیں۔۔۔آج۔۔۔پتہ نہیں کب؟۔۔۔ابا بھی تھا۔۔۔اماں بھی تھی۔۔۔ظفر بھی تھا۔۔۔وہ بات چیت نہیں کر سکتے تھے۔ان سب کی زبانیں کہنی اتنی لمبی تھیں۔باہر بندوقوں۔۔۔کلاشنکوفوں کی آوازیں گونج رہی ہیں۔لوگ مرتے ہوں گے۔مریں نہیں، زخمی ہوں۔۔۔وہ روئیں گے تو میں ہنسوں گا۔۔۔ہنسنے میں زیادہ مزہ ہے۔ماں! تم کہاں ہو؟ تم نے مجھے چونی پہلے کیوں نہیں دی تھی؟

۔۔۔میں چھولے کھاتا۔۔۔نہیں، پیسے تو تمہیں اَبا دیتے ہیں۔۔۔اَبا برا ہے۔۔۔نہیں نہیں، برا تو صاحب ہے جو اَبا کو پیسے دیتا ہے۔

۔۔۔باہر تیز طوفان ہے، پتہ نہیں کتنے درخت گرے ہیں؟۔۔۔بارش بھی ہو رہی ہے۔۔۔ کوئی ہے جو مجھے وہاں سے سُرخ پھول لا کر دے۔۔۔سسٹر کہتی ہے، صبح کو لا کر دوں گی۔ہنستی ہے، اسے یقین نہیں آتا کہ درخت گرے ہوں گے۔۔۔میں جھوٹ تھوڑی بول رہا ہوں۔

ظفر کا باپ آیا تھا، یہاں ہسپتال میں، بچارے کے دونوں ہاتھ مشین میں آ کر کٹ گئے ہیں۔ظفر تو میرا دوست ہے۔۔۔یہ اس کا باپ نہیں ہے، کسی اور کا باپ ہوگا۔۔۔وہ چیختا ہے۔۔۔مجھ سے مت ملو، میں ہاتھ کیسے ملاؤں گا۔۔۔خاموش ہی نہیں ہوتا۔۔۔میں نے اسے چلا کر کہا، تمہاری طرف سے میں ہی مصافحہ کر لوں گا۔۔۔نہیں، نہیں میں مصافحہ کرنے کی بجائے اُنہیں بُجّہ ☆ دوں گا۔سسٹر کو نہیں دوں گا۔دیکھ، سسٹر! دیکھ۔۔۔میرے بیڈ پر نوزائیدہ بچی رو رہی ہے۔مریض کہتے ہیں۔۔۔تمہاری بیٹی

ہے۔۔۔میں نے تو شادی بھی نہیں کی ہے۔مردوں کو حمل تھوڑی ہوتا ہے۔۔۔سسٹر نے ہنس کر کہا، پہلے اس کی تصویر بناؤ تو پھر اسے لے جاؤں۔دو چھوٹی آنکھیں، ناک، سرخ ہونٹ، میں اس کے بالوں میں پونی ٹیل باندھتا ہوں۔۔۔اب وہ نہیں روتی۔شاید اسے سسٹر اُٹھا کر لے گئی۔۔۔میں نے اس کا نام رکھا ہے۔''لارا''۔

کوئل کہتی ہے، میں کُو کُوں؟۔۔۔اتنی لمبی کُوک! چپ ہی نہیں کرتی۔۔۔اسے ماروں؟۔۔۔ نہیں، مارا نہیں جاتا، ڈانٹا جاتا ہے۔۔۔موہن جودڑو روڈ پر علی نے ائیر گن سے تو تا مارا، وہ بیٹھا ہے بیوی کے ساتھ، ڈانٹوں اسے؟۔۔۔نہیں چھوڑو۔۔۔اس کی بیوی کی پیشانی پر بھی آنکھ ہے۔

آؤ آؤ کستورہ! کچہری کرتے ہیں۔اچھا، یوں کرو کہ چڑیا، کوئل اور دوسرے پرندوں کو بھی کہو، لیکن میں سب کو ہڑپ کرتا جاؤں گا۔۔۔پھر میں سب سُروں میں گاؤں گا۔۔۔

اب دیکھیے نا! ڈاکٹر ہارمونیم بجاتے ہیں۔۔۔ان کے خیال میں، میں کچھ نہیں سمجھتا۔۔۔وہ ہارمونیم کے سُروں میں دراصل گالیاں دے رہے ہیں۔۔۔سمجھتے ہیں کہ میں نیند میں انٹا غفیل پڑا ہوں۔۔۔

۔۔۔ہاں، میں سب کو نگل گیا۔ میں نے ان کے ساتھ دھوکہ کیا۔۔۔میں تو شیر بن گیا ہوں۔۔۔اب ہر ایک کو چیر پھاڑ کر رکھ دوں گا۔۔۔سب مریض ہنستے ہیں۔

ایک مریض کے دانت تو کتنے لمبے ہو گئے ہیں؟ فرش پہ گھس رہے ہیں۔۔۔ماں انگارے کھایا کرتی ہے۔ابا ایٹم بم ہے۔۔۔ظفر تو بارود سے بھرا ہوا ہے۔میں کل سب کو نگل جاؤں گا، پھر بم بن جاؤں گا۔۔۔گھر رگھر رر۔۔۔جہاز آتے ہیں۔اب مجھے پھٹنا چاہیے۔۔۔سب مر جائیں گے۔۔۔کچھ نہیں بچے گا!۔۔۔میں ڈاکٹروں والا ہارمونیم بجاؤں گا۔۔۔اس پر ماتمی دُھن نہیں ہوگی، فاختہ، کوئل، چڑیا، کستورہ، لارا، اَبا، اماں، ظفر، سب گائیں گے۔۔۔بم بچارے روئیں گے۔۔۔بموں کے ساتھ کیا نا میں نے دھوکہ۔۔۔ہم گائیں گے۔۔۔ارے۔۔۔ارے! وہ دیکھو۔۔۔کائنات میں بکھرے ہوئے ستاروں نے بھی میرے ساتھ ابھی سے ہنسنا شروع کر دیا ہے۔

☆ بُجّہ۔لعنت ملامت کرنے کے لیے دایاں پنجہ پھیلا کر دکھا دینا۔

☆☆☆

ڈاکٹر عباس برمانی

محبت کی موت

وہ سراپا محبت تھا، سرتاپا تبسم تھا۔ بچوں کے علاوہ اگر کہیں ملکوتی مسکراہٹ کا تصور آپ کے ذہن میں آتا ہے تو وہ اس کے چہرے کو دیکھ کر آتا تھا حالانکہ اس کے چہرے پہ گھنی داڑھی تھی جو خاص انداز سے بدل دے کر گھنگریالی بنائی گئی تھی۔ اس کی ستواں ناک کے اطراف دوگلابی آنکھیں سو فیصد کسی پہاڑی عقاب کی آنکھیں تھیں، لیکن ان کے اندر لہریں لیتا تبسم جانے کہاں سے آبسا تھا۔ اس کا اندازِ تکلم، اس کی باوقار چال، تیز تیز چل کر کام کرنا، لیکن کوئی بھاگ دوڑ کا تاثر نہیں۔۔۔ اس کا سلام کرنے کا انداز مصافحہ اور معانقہ کرنے کا ڈھنگ، بزرگوں کو جھک کر ''چھاذ آدستہ'' (قدموں پر ہاتھ) کہہ کر ملنا۔۔۔۔ میں نے اسے کبھی کسی کے ساتھ جھگڑتے ہوئے، کسی کو بُرا بھلا کہتے ہوئے، کسی کی غیبت کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ کوئی بزرگ کچھ اُٹھا کر لے جا رہا ہے تو وہ اصرار کر کے اس کا بوجھ خود لے لیتا (مویشیوں کو اس قدر پیار کے ساتھ سہلاتا اور تھپتھپاتا کہ حیرت ہوتی تھی) کوئی چرواہا کسی مویشی کو مار رہا ہے تو اسے نرمی کے ساتھ منع کرتا۔ وہ سرندہ بہت مہارت سے بجاتا تھا، اُسے مست توکلی کا اچھا خاصا کلام یاد تھا۔ جب سرندہ بجاتے ہوئے وہ مست کا کلام گاتا تو لگتا تھا کہ اس کی روشن آنکھوں میں سموا اُتر آئی ہے

سموتو پلکیں اُٹھاتی ہے تو
سال ہا سال کی جدائی کی اذیتوں سے نجات مل جاتی ہے
تیرا حسیں، خرام، تیرا دل نشیں تبسم، بُری مُشک بار قامت
انہیں مجھ سے دور مت کر
تیرے خدوخال اور اعضاء بے عیب موتی ہیں
سموتو بولتی ہے تو یوں لگتا ہے
جیسے صبح کے وقت کہیں ستار بج رہا ہو
سموایک چٹان پر چلی جا رہی ہے
میرے دل میں جذبات اژدر کی طرح لہرا رہے ہیں
میرے قلب میں ہزاروں طوفان برپا ہیں
اور شاعری کے نئے راستے وجود میں آ رہے ہیں

اس کا تعلق مریوں کے بجرانی قبیلے سے تھا، گرینی قبیلے کے ساتھ کسی جھگڑے کے نتیجے میں وہ

اپنے خاندان سمیت کاہان کے پہاڑوں کو چھوڑ کر کوہِ سلیمان کے دروں کو عبور کرتا ہوا چوٹی زیریں کے نواح میں واقع ریگزار میں آبسا تھا، کیونکہ وہ خونریزی نہیں چاہتا تھا۔ مردِ کوہستانی اب بندۂ صحرا ہو گیا تھا۔ خیمہ نام کی چند آماجگاہیں جو نہ بارش سے بچاتی تھیں اور نہ آندھیوں سے، چند بکریاں، دو چار برتن اور چند بندوقیں ان کا اثاثہ تھیں۔ اگرچہ قانونی طور پر وہ یہاں بندوق نہ رکھ سکتے تھے، لیکن ایک کوہستانی بلوچ کے ہاتھ سے آپ بندوق کیسے رکھوا سکتے ہیں، یہی بہت تھا کہ انہوں نے بندوقوں کو غلافوں میں ڈال لیا تھا۔۔ بلکہ یہاں تو انہیں ریت میں دبا دیا گیا تھا، صرف راتوں کو دو بندوقیں کھود کر نکالی جاتیں اور صبح پھر زمین میں گاڑ دی جاتیں۔

محبت خان کو میرے ایک دوست نے میرے پاس بھیجا تھا۔ لاہور سے مستنصر حسین تارڑ میرے گاؤں میں آ رہے تھے۔ ان کی دعوت کے لیے مجھے کوئی اچھا سجی بنانے والا چاہیے تھا۔ میرے دوست نے کہا ہمارے لوگ اتنی لذیذ سجی نہیں بنا سکتے۔ یہاں بلوچستان سے کچھ مری آئے ہوئے ہیں۔ میں اُنہیں تمہارے پاس بھیجوں گا چنانچہ محبت خان اور اس کا بھائی صورت خان میرے گاؤں آ گئے۔ تارڑ صاحب ٹھہرے کوہ نورد آدمی اور وہ آئے بھی دریائے سندھ کے جنگل بیلوں میں کچھ وقت گزارنے تھے، چنانچہ اُن کی فرمائش پر گاؤں سے باہر ویرانے میں ریت پر خیمہ نصب کیا گیا۔ الاؤ روشن کیا گیا۔ محبت خان اور صورت خان نے بکری کی سجی بنائی۔ صحرائی ماحول تھا، چاندنی رات تھی، الاؤ تھا اور بزمِ دوستاں تھی، سب پہ سرخوشی سی طاری ہو گئی تھی، وقت کا حساب کتاب ختم ہو گیا تھا۔ محفل کب ختم ہوئی اور میں کب گھر لوٹا مجھے یاد نہ تھا۔ سحر خیزی کی عادت شروع سے ہے۔ طلوعِ آفتاب سے قبل بیدار ہوا تو دوستوں کی خیر خبر لینے چل پڑا۔ انہوں نے اصرار کیا تھا کہ وہ ڈیرے کی بجائے خیمے میں سوئیں گے چنانچہ خیمے میں بستر وغیرہ لگا دیے گئے تھے۔ میں جب وہاں پہنچا تو بجھے ہوئے الاؤ کے پاس صورت خان گھٹنے چھاتی سے لگائے چادر میں لپٹا سو رہا تھا جبکہ محبت خان بندوق سینے سے لگائے اکڑوں بیٹھا تھا اور اُنگلیوں سے الاؤ کی راکھ کو کھدیڑ رہا تھا۔ ان دونوں بھائیوں نے تمام رات کھلی ہوا میں اور سردی میں گزاری دی تھی۔

''محبت خان تم یہاں ہو، تم ڈیرے پہ جا کے سو جاتے'' میں نے کہا۔ اس نے جواب دیا ''سائیں آپ آدھی رات کو چلے گئے، مہمانوں کے پاس کسی کو چھوڑا نہیں۔ مہمانوں کی حفاظت تو ضروری تھی نا سائیں، تو ہم یہاں رُک گئے۔''

مجھے خاصی شرمندگی محسوس ہوئی، بہرحال میں نے محبت خان کا شکریہ ادا کیا۔ جب مہمانوں کو اس بارے میں بتایا تو وہ بھی بہت متاثر ہوئے۔ تارڑ صاحب نے کہا ''یار اُنہوں نے سجی بہت لذیذ بنائی تھی میں نے کوئٹہ سیرینا میں بھی ایک وی آئی پی ضیافت میں سجی کھائی تھی، لیکن اِس سجی کے ساتھ اُس کا کوئی موازنہ نہیں۔'' پھر چند لمحے توقف کر کے بولے ''جب میرے بیٹے سمیر کی شادی ہو گی تو تم انہیں لاہور لے آنا ہم ان سے ولیمے کے لیے سجی بنوائیں گے۔ محبت خان نے بھانپ لیا کہ اس کا ذکر ہو رہا ہے،

اس نے مجھ سے پوچھا ''صاحب چھے گشغیں سائیں'' (صاحب کیا کہہ رہے ہیں) میں نے بتایا تو چھاتی پر ہاتھ رکھ کے جھکا اور کہا ''حاضر صاحب حاضر''۔

چلتے وقت تارڑ صاحب نے اس کی مُٹھی میں سو کا نوٹ دے دیا۔ محبت خان نے ہاتھ یوں جھٹکا گویا اس کی ہتھیلی پہ جلتا ہوا انگارہ رکھ دیا گیا ہو، نوٹ زمین پر گر گیا اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا ''صاحب میں لاہور نہیں آؤں گا۔'' ایسا تھا محبت خان۔ میں نے اسے اپنے کلینک پہ چوکیدار رکھ لیا۔ وہ رات نو بجے وہاں آ جاتا، فجر کے وقت سو جاتا اور پہر دن چڑھے اپنی خیمہ بستی چلا جاتا۔ جہاں اس کی بھیڑ، بکریوں کی تعداد بڑھ رہی تھی۔ اس کے بھائی صورت خان نے ایک زمیندار کے باغ میں باغبان کی ملازمت کر لی تھی جبکہ اُن کے دو چچازاد بھائی ایک جینک فیکٹری میں چوکیداری کرنے لگے تھے۔ انہوں نے میرے اصرار پر اپنے بچوں کو قریبی پرائمری سکول میں داخل بھی کرا دیا تھا۔ میں نے انہیں اپنے ایک دوست سے ایک پولٹری فارم کی متروکہ عمارت دلوا دی تھی اور اب وہ خیمے کی بجائے چار دیواری میں رہنے لگے تھے، لیکن سوتے وہ اب بھی زمین پر تھے۔

وہ جب پہلی بار میرے ڈیرے پر آیا تھا تو چارپائی کی بجائے زمین پر بیٹھ گیا تھا۔ میں نے چارپائی پر بیٹھنے کو کہا تو وہ بولا ''سائیں ما کٹ چھکا نندوں مٹی سغر تری'' (سائیں میں چارپائی پر بیٹھوں تو مجھے چکر آتے ہیں)۔

پھر ملکی سیاست نے کروٹ بدلی، گزینی سرکار کے معتوب ٹھہرے، انہیں فراری اور دہشت گرد کہا جانے لگا، ان کی بستیوں پر بمباری کی جانے لگی، بجرانیوں کی ملیشیا بنائی گئی انہیں اسلحہ اور روپے دیے گئے۔ میں نے محبت خان سے کہا ''اب تو تمہارے قبیلے کا راج ہے اب تم واپس چلے جاؤ۔'' میں نے پہلی بار اس کے لہجے میں تلخی دیکھی ''سائیں میں تھوکتا ہوں ایسے راج پر'' اس نے غصے سے کہا، پھر کچھ نرم پڑا اور بولا ''سائیں یہ بڑے لوگوں کی آپس کی جنگ ہے، اس میں ہم غریبوں کو مروایا جا رہا ہے، میرا تو گزینیوں کے ایک گھرانے کے ساتھ مقامی جھگڑا ہے؟ پہلے ہمارے بڑوں نے گزینیوں کے ساتھ مل کر ایک جنگ لڑی تھی، ہمیں کیا ملا۔۔۔ یتیم بچے، بیوہ مائیں، جلی ہوئی جھونپڑیاں اور کھیت، مویشیوں کے پنجر، دربدری اور بھوک پھر اس نے مست کے کچھ اشعار پڑھے۔

جواں نینت جنگاں نی بدیں بولی
کھے وٹی مال و مڑوماں رولی

سو کی سرزمین پہ جنگ کی بُری باتیں اچھی نہیں لگتیں، کون اپنے عزیزوں اور مویشیوں کو دربدر کرنا چاہے گا؟

ایک روز بارکھان کے علاقے کے ایک کھیتران سردار جو میرے دوست تھے مجھ سے ملنے آئے، ان کے ساتھ ان کے ایک دوست تھے جو گزینی مریوں کے سردار خیر بخش خان کے قریبی عزیز

تھے۔ محبت خان بڑے تپاک اور احترام کے ساتھ اُن سے ملا اور انہیں میرے پاس چھوڑ گیا۔ ہم کمرے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ محبت خان دروازہ کھٹکھٹائے بغیر اندر آ گیا اور گزینی سردار کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا ''ڈاکٹر صاحب اگر یہ میر صاحب چاہیں تو ہم اپنے گھروں کو لوٹ سکتے ہیں، آپ ان سے ہماری سفارش کریں۔''

میر صاحب نے اس کا مسئلہ سُنا اور وعدہ کیا کہ وہ ایک ہفتے کے اندر اس کا جھگڑا طے کرا دیں گے۔ چنانچہ وہ تنازعہ سلجھا لیا گیا اور محبت خان کا خاندان اپنے کوہستان کو لوٹ گیا۔ جاتے وقت اس نے مجھ سے کہا 'صاحب دعا کرو یہ جنگ ختم ہو جائے میں آپ کو مست اور سمو کی زیارت پہ لے جاؤں گا اور آپ کو کاہان کا وہ قلعہ دکھاؤں گا جہاں ہمارے بزرگوں نے انگریزوں سے ہتھیار رکھوائے تھے۔ میں آپ کو وہاں ایسے سفید ریشوں سے ملواؤں گا جو آپ کو اس زمانے کے قصے سنائیں گے پھر آپ انہیں لکھنا، اور کاہان کے قلعے کے ساتھ محبت خان کا فوٹو بھی اخبار میں چھپوانا۔''

محبت خان کو گھر لوٹے ہوئے ڈیڑھ سال ہو گیا تھا، اس دوران اس کے کئی فون کوہلو سے آئے وہ بہت مطمئن لگتا تھا، وہ مجھے اپنے ریوڑ کے بارے میں بتاتا، بارشوں کے بارے میں آگاہ کرتا۔ اس کا آخری فون کوہلو میں ملک کی ایک اہم شخصیت کی جلسہ گاہ سے ایک کلومیٹر دور راکٹ گرنے والے واقعے کے دو دن بعد آیا۔ اس نے کہا تھا سائیں جس نے بھی یہ کیا ہے بُرا کیا ہے، اس کی سزا بے گناہ لوگ بھگتیں گے۔

گزشتہ ماہ میں سمیر تارڑ کے ولیمے میں شرکت کے بعد لاہور سے واپس آیا تو اس کے اگلے دن میرے گاؤں کا ایک شخص جو کوہلو میں ہائی وے کے ایک ٹھیکیدار کے ساتھ کام کرتا تھا کلینک پہ آیا اس کے معدے میں تیزابیت تھی، نسخہ لے کر جاتے جاتے وہ رُکا اور بولا ''ڈاکٹر صاحب وہ محبت خان نہیں تھا، مری، جو آپ کا چوکیدار ہوا کرتا تھا وہ بے چارہ مر گیا ہے۔''

''اوہ میرے خدا، محبت مر گیا ہے، کیا ہوا ہے۔''

''وہ سر ایسا ہوا کہ وہ جاندران کے کسی دُشوار گزار علاقے کا ایک گزینی ہمارے ہاں کام کرتا تھا، ایک ایکسیڈنٹ میں اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی، ٹھیکیدار صاحب نے پلستر وغیرہ چڑھوایا، اس شخص کا اصرار تھا کہ اسے کسی بھی طرح اس کی بستی پہنچایا جائے، وہاں صرف گھوڑے کا راستہ ہے اور اس علاقے میں آپریشن بھی چل رہا تھا۔ محبت خان کو علم ہوا تو اس نے کہا میں اسے چھوڑ آؤں گا۔ وہ ایک گھوڑا لے آیا اور زخمی کو اس پہ سوار کر کے اس کی بستی لے گیا۔ اُسی رات بستی پر بمباری ہوئی۔ کہا گیا کہ وہ فراریوں کا کیمپ تھا۔ اس حملے میں کئی مرد، عورتیں، بچے اور مویشی ہلاک ہوئے۔ ان مارنے جانے والے گزینیوں میں ایک بجرانی بھی تھا جو ایک زخمی گزینی کو اس کے گھر چھوڑنے گیا تھا اور وہ تھا محبت خان۔ جنگ سے نفرت کرنے والا محبت مر گیا، جنگ ابھی جاری ہے۔ میں کاہان قلعہ کی فصیل کے سامنے کھڑے محبت خان کی

تصویر کبھی نہ اُتار سکوں گا۔ میں مست اور سمو کی زیارت بھی نہ کر سکوں گا۔۔۔وہ کہا کرتا تھا کہ سمو کی سرزمین پہ جنگ کی بُری باتیں بھی اچھی نہیں لگتیں۔ مجھے صورت خان ملے تو میں اس سے پوچھوں کہ اس نے محبت خان کی بندوق اور سرندہ کا کیا کیا ہے، بندوق جسے وہ اس کے غلاف سے نہیں نکالنا چاہتا تھا اور سرندہ جسے بجانے کے وہ بہانے ڈھونڈتا تھا، یہی سرندہ بجاتے ہوئے اس نے مست کے وہ اشعار گائے تھے جو انہوں نے کسی جنگ میں ہونے والی اپنے بھائی کی موت پر کہے تھے۔

بھائی میں تمہاری بندوق کس دریا کی نذر کروں
اور تمہارا سرندہ کس ڈوم کو دوں
لیکن میں اسے کسی ڈوم کو نہیں دوں گا
بلکہ اسے جاندران پہاڑ کی اُونچی چوٹی پر رکھ دوں گا
فرشتے اسے بجائیں گے
اور پرندے نغمے گائیں گے

☆☆☆

ظفؔر اقبال

کہیں پہ موجود، اور، کہیں سے ہٹے ہوئے ہیں
زمین پر ہیں، مگر، زمیں سے ہٹے ہوئے ہیں

کہیں گئے ہیں نہ جانے والے ہیں سانپ اپنے
یہیں پہ ہیں، لیکن، آستیں سے ہٹے ہوئے ہیں

کمی کوئی آ رہی ہے رسوائیوں میں شاید
کہ داغ اب کے مری جبیں سے ہٹے ہوئے ہیں

یہ فاصلے گھٹتے بڑھتے بھی ہیں، سو، آج کل وہ
قریں تو ہیں ہی، ذرا قریں سے ہٹے ہوئے ہیں

مکیں بھی رہتے ہیں اِن مکانوں میں اجنبی سے
مکاں بھی جیسے ہر اک مکیں سے ہٹے ہوئے ہیں

جُڑے ہوئے ہیں وہ دوسروں کے تو ساتھ اب بھی
ہٹے ہوئے ہیں تو بس ہمیں سے ہٹے ہوئے ہیں

ہماری آنکھیں ہی خالی خالی ہیں مدتوں سے
مگر، وہ منظر کہیں یہیں سے ہٹے ہوئے ہیں

ستم تو یہ ہے کہ ہاں بھی کرتے نہیں ہیں کھل کر
اگرچہ وہ آج کل نہیں سے ہٹے ہوئے ہیں

خراب اُفتادِ طبع نے بھی کیا ظفؔر کو
جہاں سے اچھے لگے، وہیں سے ہٹے ہوئے ہیں

☆☆☆

ظفؔر اقبال

ٹھہر گئے ہیں تو ہم سہاروں میں رہ گئے ہیں
اگر چلے ہیں تو رہگزاروں میں رہ گئے ہیں

چھلک سکیں باہر، اِتنی کوشش تو کی ہے، لیکن
اُچھل اُچھل کر بھی ہم کناروں میں رہ گئے ہیں

سوادِ ساحل پہ منتظر تھا کوئی، مگر، ہم
کچھ اپنے پانی کے تیز دھاروں میں رہ گئے ہیں

ہمارے کس کام یہ نئی زندگی کی مہلت
سو آئے ہیں کہ اپنے پیاروں میں رہ گئے ہیں

بھگت گئے سب، ہماری باری ہی آ نہ پائی
یہاں کھڑے ہم یونہی قطاروں میں رہ گئے ہیں

یہ لگ رہا ہے، ہمارے حصے کے سارے دریا
وہیں کہیں اپنے کوہساروں میں رہ گئے ہیں

یہ ایک امانت ہے جس کو لوٹانا چاہتا ہوں
ترے ستارے مرے ستاروں میں رہ گئے ہیں

مزہ تو یہ ہے، سنور گئی عاقبت اُنہی کی
جو چار دن ہم گناہگاروں میں رہ گئے ہیں

ظفؔر، رہا ہو کے آئیں گے دیکھنا کسی دن
ہوا کے جھونکے جو شاخساروں میں رہ گئے ہیں

ظفر اقبال

ظفر، فسانوں کہ داستانوں میں رہ گئے ہیں
ہم اپنے گزرے ہوئے زمانوں میں رہ گئے ہیں

عجب نہیں ہے کہ خود ہوا کے سپرد کر دیں
یہ چند تنکے جو آشیانوں میں رہ گئے ہیں

مکین سب کُوچ کر گئے ہیں کسی طرف کو
اب اُن کے آثار ہی مکانوں میں رہ گئے ہیں

سُنا کرو صبح و شام کڑوی کسیلی باتیں
کہ اب یہی ذائقے زبانوں میں رہ گئے ہیں

پسند آئی ہے اس قدر خاطر و تواضع
جو مہماں سارے میزبانوں میں رہ گئے ہیں

ہمیں ہی شوکیس میں سجا کر رکھا گیا تھا
پڑے ہمیں شہر کی دُکانوں میں رہ گئے ہیں

ابھی یہی انقلاب آیا ہے رفتہ رفتہ
جو رونے والے تھے، ناچ گانوں میں رہ گئے ہیں

الگ الگ اپنا اپنا پرچم اُٹھا رکھا ہے
کہ ہم قبیلوں نہ خاندانوں میں رہ گئے ہیں

ظفر زمیں زاد تھے، زمیں سے ہی کام رکھا
جو آسمانی تھے، آسمانوں میں رہ گئے ہیں

ظفر اقبال

گزر گئیں مدتیں، برابر کھڑے ہوئے ہیں
ہمیں نہ چھیڑو، ہم اپنے اندر کھڑے ہوئے ہیں

کسی کی آمد کے منتظر بھی نہیں اگر ہم
تو کس لیے ایک رہگزر پر کھڑے ہوئے ہیں

یونہی ذرا بند ہے ابھی داخلہ ہمارا
اِسی لیے آج گھر سے باہر کھڑے ہوئے ہیں

اب اپنا سود و زیاں سمجھتے ہیں، اس لیے ہم
کسی کے پاس، اور، کہیں سے ہٹ کر کھڑے ہوئے ہیں

اِسی طرح سے ہے اِن ہواؤں میں اپنا ہونا
کہیں پہ بہتر، کہیں پہ کمتر کھڑے ہوئے ہیں

بٹھا دیا تھا ہمیں جھڑکنے کے بعد اُس نے
کسی توقع پہ اب مکرر کھڑے ہوئے ہیں

کسی اشارے پہ ہیں یہی موم ہونے والے
جو لگ رہا ہے کہ جیسے پتھر کھڑے ہوئے ہیں

دیئے ہیں، اور، روشنی نہیں دے رہے کہیں پر
درخت ہیں، اور، کب سے بنجر کھڑے ہوئے ہیں

یہ آپ کی بزم ہی کا اُسلوب ہے کہ ہم نے
ظفر کو دیکھا ہے جب بھی، اکثر کھڑے ہوئے ہیں

☆☆☆

قاضی حبیب الرحمٰن

سُنتا ہے نہ دیکھتا ہے پتھر / کس زعم میں مُبتلا ہے پتھر
دن رات - اپنے وجود میں گم / جانے - کیا سوچتا ہے پتھر
کھلتا نہیں - ٹوٹ جائے ہر چند / تقدیر کا مسئلہ ہے پتھر
اپنی تنہائیوں میں - گویا / خاموش مکالمہ ہے پتھر
یہ چپ - یہ ازل اَبد کی ہیبت! / اِس چپ میں گونجتا ہے پتھر
اے دل - سُنتا ہے کون، کس کی؟ / جو ہے اپنی جگہ ہے پتھر
پہلو میں - آئنہ رُخوں کے / اکثر دیکھا گیا ہے پتھر
ہر سو - بکھرے پڑے ہیں شیشے / ظالم کی اِک اِک ادا ہے پتھر
ریزہ ریزہ ہوئے - بَلا سے / بارے - کچھ تو کھلا ہے پتھر
اِس عہدِ شکستگی میں - گویا / اک صورتِ رابطہ ہے پتھر
پا کر - اُس آنکھ کا اِشارہ / دل بن کے دھڑک رہا ہے پتھر
تاریخ - اِس بات پر ہے شاہد / جب - ہاتھ میں بولتا ہے پتھر
اللہ رے - مِن شَعَائِرِ اللہ! / از مَروہ تا صَفا ہے پتھر
رُکنِ اسود سے تا یمانی / کیا کیا - جلوہ نُما ہے پتھر
اُس منزلِ جاں کے دو اہم موڑ / اک ثور تو اک حِرا ہے پتھر
تین و زیتون و طور و مکہ / کس نور کا سلسلہ ہے پتھر
ہر بزمِ تمدن - اِس سے روشن / ہر رسم کی ابتدا ہے پتھر
پتھر سے پھول کھِل رہے ہیں / یہ بادِ صبا ہے یا ہے پتھر
بے ساختہ - جی میں لہر آئی / دریا ہے کہ بہ رہا ہے پتھر
سر پر ہے تو آفتاب و مہتاب / جو - آ گیا زیرِ پا ہے پتھر
کنکر ہو کہ جوہر - آخر الامر / پتھر میں چھپا ہوا ہے پتھر
افلاک پہ مہر و ماہ و انجم / دھرتی پر دیوتا ہے پتھر
سب - آپ ہُنر کے معجزے ہیں / ورنہ - وہی آئنہ ہے پتھر
چشمِ حیرانِ شَش جہت میں / صدیوں کا رتجگا ہے پتھر
مَذہب ہو کہ فلسفہ کہ سائنس / ہر رنگ میں - مسئلہ ہے پتھر
اہلِ معنی - ذرا سمجھ کر! / حرفِ حق کا صِلہ ہے پتھر

عاقل کے لیے - اشارہ کافی!
اندھوں کے لیے - دِیا ہے پتھر

اِملا سے الگ - حقیقتِ لفظ!
پتھر سے ماورا ہے پتھر

اِس اوٹ میں دوسرا ہے کوئی
اِس بات کا رمزیہ ہے پتھر

ہر ذرہ ہے - عالمِ کشاکش
تجسیمِ گُہر با ہے پتھر

یہ بھاگتے دائرے - یہ اجرام
آخر - یہ کیا بلا ہے پتھر؟

یہ درد ، یہ جبر - کون سمجھے؟
کس شوق سے ناچتا ہے پتھر!

تھک ہار کے - رقصِ زندگی سے
قدموں میں گِری انا ہے پتھر

کھا کھا کے ٹھوکریں - بالآخر
دہلیز سے آ لگا ہے پتھر

پیوست ہیں لب بہ لب - تو پھر کیا؟
اک بیچ میں فاصلہ ہے پتھر

وہ شام ، وہ تو ، وہ چاند لمحہ!
یہ - سینے پر دَھرا ہے پتھر

جاتا نہیں دل سے - ذوقِ عصیاں
آئینے سے جھانکتا ہے پتھر

ہاں اہلِ طلب - ذرا سنبھل کر!
اِس دشت میں جابجا ہے پتھر

دُکھ درد سے کون گھر ہے خالی؟
رستے کا آبلہ ہے پتھر

بے تابیِ دل کے سَو حوالے!
سرتاپا - زلزلہ ہے پتھر

ہوگا کوئی تہ میں غم - یقیناً
چشمہ سا جو پھٹ پڑا ہے پتھر

شاید - کوئی عقدہ نخستیں
ذرّوں میں کھولتا ہے پتھر

کھلتا نہیں حالِ دل - کہ آخر
کس بات پر مر مِٹا ہے پتھر

رکھتا نہیں خود سے بھی علاقہ
کس درجہ - خود آشنا ہے پتھر!

اپنی ہی ذات کے مقابل
دشمن کا ہمنوا ہے پتھر

نیرنگِ زماں کی نسبتوں سے
ہمرنگِ فنا بقا ہے پتھر

دیکھے کوئی - اُس کی سخت جانی
جس دل کا مُدعا ہے پتھر

قرنوں سے ایک ہی روش پر
دَم سادھے ہوئے پڑا ہے پتھر

خالی نظروں - اُفق کے اُس پار
پہروں - یونہی گھورتا ہے پتھر

آوارہ ہواؤں ، بادلوں کو
ہر گام پہ - سانستا ہے پتھر

کچھ روز سے ہو رہا تھا محسوس
لاوا سا ٹپک رہا ہے پتھر

عاد اور ثمود پر نہیں بَس
ہر عہد کا سانحہ ہے پتھر

اِمسال - بجائے گُل ، زمیں سے
قریہ قریہ - اُگا ہے پتھر

ہر سمت سے ہو گئے ہیں محصور
ہر سمت سے وہ چلا ہے پتھر

سب بند پڑی ہیں - رہگزاریں
بس - ایک ہی راستہ ہے پتھر

پھر اس کے بعد - کچھ نہ پوچھو!
جیسے - کوئی باؤلا ہے پتھر!

اب کون بتائے - کون کیا تھا؟
کس کس میں سما گیا ہے پتھر

پانی کیا چیز ہے - یہاں تو
افلاک پہ تیرتا ہے پتھر

اِس سر پھرے آسماں کے نیچے
اک آخری معرکہ ہے پتھر

جس سمت نظر اُٹھاؤ - آگے
سینہ تانے کھڑا ہے پتھر

اسبابِ سفر - ابھی نہ کھولو!
باقی - اک مرحلہ ہے پتھر

ممکن ہی نہیں نباہ ، اِس سے
کم ظرف معاملہ ہے پتھر

دل سے دل تک ، بچھا ہے مقتل
بُزدل کا حوصلہ ہے پتھر

ہر روز ہے - تازہ زخم کوئی
ہر روز - کوئی نیا ہے پتھر

ہر شخص - اُٹھائے پھر رہا ہے
ہر شخص کا اک جُدا ہے پتھر

کچھ کہیے - تو گونجتا ہے کیا کیا!
یوں کہنے کو ، بے صدا ہے پتھر

اک دن کی ہو بات - صبر کر لیں
یہ - روز کا واقعہ ہے پتھر

مجبور کا انتقام - توبہ!
مُنہ ، ہاتھ ہے اور دُعا ہے پتھر

یہ مسئلہ - ایسے حل نہ ہوگا
اب - وقت کا فیصلہ ہے پتھر

توڑیں گے قوس قوس ، اس کو
اک جبر کا دائرہ ہے پتھر

پہلا تو ٹھکانے جا لگا ہے
یہ - ہاتھ میں دوسرا ہے پتھر

ذرے ذرے کا وزن ہوگا
معیارِ جزا سزا ہے پتھر

اہلِ طاقت - لرز رہے ہیں
کمزور کا اسلحہ ہے پتھر

اب دیکھیے - کون ہمسفر ہو؟
ڈھلوان سے چل پڑا ہے پتھر

تا بھول نہ جائے خود کو رہرو
رستے میں رکھ دیا ہے پتھر

دردِ دل میں بھی کام دے گا
دردِ سر کی دَوا ہے پتھر

اندر ہے عکسِ خواب کوئی
باہر - تعبیر کا ہے پتھر

ٹوٹے نہ کہیں ، حصارِ وحشت
اک سر تو ہزار ہا ہے پتھر

اِس گنبدِ حبسِ آرزو میں
اک صورتِ دلکُشا ہے پتھر

دیکھو تو حبیب - صرف مٹی
سوچو تو - کیا سے کیا ہے پتھر!

ظُلمت میں نور کا تماشا
تا حدِّ سحر - رسا ہے پتھر

☆☆☆

ڈاکٹر سعید اقبال سعدیؔ

نیند میں اس زندگانی کا سفر اچھا نہیں
اس قدر بھی معتبر ہو یہ بشر ، اچھا نہیں

وہ تخیل میں رہے ہر موڑ پر ہر گام پر
خواب کا ایسا سفر ہے پُر خطر ، اچھا نہیں

پیار پر ہے آج کل ہر سو ہوس چھائی ہوئی
کام اچھا تھا کبھی یہ اب مگر اچھا نہیں

اس سے دل کی دھڑکنیں بے ربط ہوتی ہیں سدا
اس قدر لوگوں کی باتوں کا اثر اچھا نہیں

کون مانے گا یہاں پر اے میرے معصوم دل
ایک تو اچھا ہے اور یہ شہر بھر اچھا نہیں

یہ بھی آخر چھاؤں تو کرتا ہے سب کی راہ میں
کس طرح مانوں کہ نخل بے ثمر اچھا نہیں

ساری دنیا کے ستارے ہی حسد کرنے لگیں
اس قدر بھی ہو ستارہ اوج پر ، اچھا نہیں

دیکھنا سعدیؔ یہی دشمن نہ بن جائے کہیں
یہ ضرورت سے زیادہ مال و زر اچھا نہیں

☆☆☆

ڈاکٹر سعید اقبال سعدیؔ

اسے اب روبرو کرنا پڑے گا
وفا کو سرخرو کرنا پڑے گا

ہمارا پیار بڑھتا جا رہا ہے
کسی کو اب عدو کرنا پڑے گا

یہاں اب لوگ بکنے لگ گئے ہیں
اَنا کو چار سو کرنا پڑے گا

بشر گمراہ ہوتا جا رہا ہے
محبت کا وضو کرنا پڑے گا

میں اس کا زخم بنتا جا رہا ہوں
اسے مجھ کو رَفو کرنا پڑے گا

عدو مغرور ہوتا جا رہا ہے
اسے بے آبرو کرنا پڑے گا

ہماری سمت منزل خود چلے گی
سفر کو جستجو کرنا پڑے گا

بدن کمزور ہیں تو فکر کیسی
دلوں کو جنگجو کرنا پڑے گا

اگر اچھی غزل لکھنی ہے سعدیؔ
اسے اب روبرو کرنا پڑے گا

مشتاق شبنم

دُکھوں کے دشت میں پیاسا کھڑا ہوں
میں اپنی ذات میں اِک کربلا ہوں

صدائے گنبدِ بے در کی صورت
سرِ امکانِ عالم گونجتا ہوں

میں وہ نغمہ ہوں جو بزمِ طرب میں
شکستہ ساز پر گایا گیا ہوں

نہ جانے کیوں سمٹ جاتے ہیں سائے
اگر زیرِ شجر میں بیٹھتا ہوں

چراغِ نقشِ پا کوئی تو دیتا
میں منزل کا اندھیرا راستہ ہوں

الجھنا خار و خس سے دھول اُڑانا
میں دشتِ غم کی اک پاگل ہوا ہوں

مجھے تاریخ دُہراتی رہے گی
میں اپنے عہد کا آموختہ ہوں

اک ایسا نقشِ عبرت ہوں میں شبنمؔ
اندھیرا ہوں اُجالا بانٹتا ہوں

مشتاق شبنم

گراں بار اس لیے اس عہد پر ہوں
میں اک سچائی ہوں اور تلخ تر ہوں

مجھے اندھوں میں کیوں بھیجا ہے تُو نے
خدایا میں تو مکتوبِ سحر ہوں

کہاں منزل کہاں ہے سمتِ منزل
میں کن لوگوں کا آخر ہمسفر ہوں

صدا دیتا ہے زخمِ نارسائی
میں ظلمت کا شکارِ تازہ تر ہوں

عناصر کی ہزاروں صورتیں ہیں
بہر رنگِ جہاں میں مشتہر ہوں

نہیں ہوتا جہانِ مصلحت میں
یہ اندازہ کہ کتنا معتبر ہوں

حصار ذات میں رہتا ہوں شبنمؔ
اَنا کی مملکت کا تاج ور ہوں

☆☆☆

حصیرؔ نوری

آج سورج برف کیوں ہے کچھ بتاؤ تو سہی
میرے دل کی آگ میں اس کو تپاؤ تو سہی

لوگ چاہیں یا نہ چاہیں یہ مری تقدیر ہے
اس جہاں میں تم مجھے اپنا بناؤ تو سہی

یوں کھڑے ہو کر تماشا دیکھتے ہو کس لیے
آگ سینے میں دہکتی ہے بجھاؤ تو سہی

بھول جانے کی ہے عادت تو بھلا دینا مجھے
پہلے تم ماضی کو اپنے بھول جاؤ تو سہی

میں تمہارا ساتھ دوں گا بحث میں تکرار میں
استعاروں کی زباں مجھ کو سکھاؤ تو سہی

ڈھونڈ لوں گا میں کسی ہموار ساحل پر پناہ
تم مجھے گہرے سمندر سے بچاؤ تو سہی

دیکھتے ہیں لوگ معنی خیز نظروں سے حصیرؔ
جو حقیقت ہے زمانے کو بتاؤ تو سہی

☆☆☆

حصیرؔ نوری

گونگے لمحے سب ہیں کوئی بولتا لمحہ نہیں
ایک لمحہ بولنے والا تھا وہ ٹھہرا نہیں

ساری دنیا کی بصیرت تیرگی میں غرق ہے
اب اُفق پر روشنی کا کوئی مینارا نہیں

جس سے پیدا ہو کسی تعمیر کی کوئی سبیل
زاویہ کوئی بھی اس کی سوچ کا ایسا نہیں

عمر بھر پتھراؤ کی زد پر رہا ثابت قدم
آدمی وہ کس قدر مضبوط ہے ٹوٹا نہیں

میری تخلیقات پر کوئی لکھے تو کیا لکھے
میرے بارے میں کسی کو کوئی اندازہ نہیں

کس قدر الجھاؤ پیدا ہو گیا ہے شہر میں
اب کہیں سلجھاؤ کا چہرہ نظر آتا نہیں

اپنی عظمت کے ترانے کیوں سناتے ہو حصیرؔ
تم کو جو پانا تھا تم نے آج تک پایا نہیں

☆☆☆

صابرؔ عظیم آبادی

اک تھکاوٹ سی جان میں کیوں ہے
آدمی امتحان میں کیوں ہے

جس نے ہم کو بھلا دیا دل سے
وہ ہمارے گمان میں کیوں ہے

جانے والا دیا بھی لے کے گیا
روشنی پھر مکان میں کیوں ہے

جب کسی سے نہیں تمہیں شکوہ
اتنی تلخی زبان میں کیوں ہے

آسماں پر کوئی فساد نہیں
یہ بکھیڑا جہان میں کیوں ہے

جو فضا پر نظر نہیں رکھتا
وہ پرندہ اُڑان میں کیوں ہے

مال و اسباب جب نہیں صابرؔ
بھیڑ اتنی دکان میں کیوں ہے

صابرؔ عظیم آبادی

مرے ندیم اِدھر سے نہیں اُدھر سے نکل
چراغ خیر جلا تیرگی کے شر سے نکل

بقا کی رکھتا ہے اُمید اس سے خواہ مخواہ
یہاں نہ ساتھ کوئی دے گا اس نگر سے نکل

تجھے میں دامنِ تقدیس میں چھپالوں گا
سرشکِ درد گہر بن کے چشمِ تر سے نکل

لگی ہوئی ہے عداوت کی آگ چاروں طرف
بچا کے دامنِ دل شعلہ و شرر سے نکل

قدم قدم پہ یہاں دھوکے باز بیٹھے ہیں
نیا فریب نہ کھا مکر کے بھنور سے نکل

زمانہ کب سے ہے دیدار کا تمنائی
کبھی سنور کے سرِ شام اپنے گھر سے نکل

اسی میں تیری بھلائی کا راز ہے صابرؔ
بُرا جو شخص ہے اُس شخص کے اثر سے نکل

☆☆☆

محمد فیروز شاہ

ہوائیں لاکھ طوفانی ہیں پھر بھی
لہو کے دیپ لافانی ہیں پھر بھی

ہمارے ساتھ دریا بہہ رہا ہے
زمینیں اپنی بارانی ہیں پھر بھی

اگرچہ راستہ جنگل نہیں ہے
کئی خطرات امکانی ہیں پھر بھی

میں ان کے درمیاں ہوں مدتوں سے
صدائیں چند انجانی ہیں پھر بھی

کئی صدیوں سے راتیں مانگ لاؤ
یہ قصے دل کے طولانی ہیں پھر بھی

سفر کرتا نہیں فیروزؔ ، کوئی
طبائع سب کی جولانی ہیں ، پھر بھی

☆☆☆

تزئین رازؔ زیدی

مضرابِ رگِ جاں ہے وہ آوازِ طرحدار
جھرنوں کے ترنم میں ڈھلی سانس کی رفتار

روشن مری دنیا ہے فقط تیرے ہی دم سے
اے مہرِ ضیاء پاش ، مرے روزنِ دیوار

اے چشمِ تصور ترا احسان ہے لیکن
اس طرح کہیں ہوتے ہیں کم ہجر کے آزار

عجلت میں تو ممکن ہی نہیں سوچنا مجھ کو
مشکل یہ ہے فرصت میں بھی تنہائی ہے درکار

خاموش پکارا کیے لب اور یہ آنکھیں
تکتی رہیں ، راہوں کو بصد حسرتِ دیدار

اے رازؔ حقیقت سے نظر اب نہ چراؤ
اس دیدۂ خوش خواب کو ہو جانے دو بیدار

☆☆☆

نبیل احمد نبیل

دشتِ بے نُور میں مہتاب کہاں سے آیا
میری آنکھوں میں ترا خواب کہاں سے آیا

میں نے تو جھیل میں پھینکا تھا ترے نام کا پھول
اور یہ سنگ سرِ آب کہاں سے آیا

شکوۂ شیوۂ اربابِ ستم کے ہوتے
چین تجھ کو دلِ بے تاب کہاں سے آیا

تُو کہ رشتوں کے تقدس سے بہت واقف تھا
تیرے لہجے میں یہ زہراب کہاں سے آیا

میں تو پتھر کے زمانے سے نہیں لَوٹا ابھی
ہاتھ میں گوہرِ نایاب کہاں سے آیا

جب مری خود سے شناسائی نہیں یار نبیلؔ
پھر مرا حلقۂ احباب کہاں سے آیا

نبیل احمد نبیل

کھلتی ہے جب سے تیری چشمِ معتبر مجھ میں
نمو پذیر ہے جیسے کوئی سحر مجھ میں

تمام عمر کٹی دشتِ بے اماں کی طرح
کھلا نہ پھول نہ مہکا کوئی شجر مجھ میں

ابھی جو خطۂ بے امن میں سلامت ہوں
ہے میری ماں کی دعاؤں کا یہ اثر مجھ میں

تمہاری زُلفِ رسا جب سے مہربان ہوئی
نمو پذیر ہے جیسے کوئی شجر مجھ میں

یہ کس کے پاؤں کی آہٹ سنائی دیتی ہے
ہُوا ہے کون بھلا عازمِ سفر مجھ میں

ہے سارا فیض نبیلؔ اُس کی ذات کا ورنہ
نہ کوئی خوبی ہے مجھ میں نہ کچھ ہُنر مجھ میں

☆☆☆